ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

۲۲ اگست ۱۹۹۵ء

☆ ہماری تحریک آزادی کے نقائص : بے لاگ تجزیہ

☆ کیا قائد اعظم سیکولر پاکستان چاہتے تھے؟

☆ اسلام کا متبادل.... جمہوریت!!

حدیثِ امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

ماہِ اگست ۱۹۹۵ء

حسن اتفاق ہے کہ امسال ۱۲ ربیع الاول اور ۱۴/ اگست صرف تین دن کے وقفہ سے ایک ہی مہینے میں واقع ہوئے ہیں۔ یہ دونوں دن ہمارے لئے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۲ ربیع الاول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت باسعادت ہے اور ۱۴/ اگست ہمارا یوم آزادی کہ جس روز دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست قائم ہوئی۔ ربیع الاول کے مہینہ کا آغاز ہوتے ہی حضورؐ کے ذکر جمیل پر' آپؐ کی حیات طیبہ اور سیرت مطہرہ پر خصوصی محافل کا سلسلہ شروع ہوا' جلسے منعقد ہوئے' درود و سلام پڑھے گئے' نعت خوانی کا پروگرام جاری رہا' چراغاں ہوا' نعتیہ کلام پر مشاعرے ہوئے' جلوس نکلے اور قومی سیرت کانفرنس بلائی گئی۔ غرضیکہ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی ساتھ یکم اگست ہی سے جشن آزادی منانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ٹیلیویژن پر اناؤنسر خواتین و حضرات نے سینوں پر پاکستانی جھنڈے کے بیج سجا لئے' کارکنان تحریک پاکستان کے انٹرویو نشر ہوئے' نغمے سنائے جا رہے ہیں' دکانوں پر مختلف سائز کے جھنڈے فروخت کے لئے سجائے گئے اور ۱۴/ اگست کو لاہور میں نہر پر "کینال میلے" کے لئے کشتیوں کے رنگا رنگ اور دلکش فلوٹ تیار کئے جا رہے ہیں۔ ویسے تو جشن آزادی بھی ہر شخص اپنے اپنے انداز میں منائے گا۔ کوئی سڑک پر چلتی موٹر سے اونچی آواز میں گلوکاراؤں کے نغمے سنا کر' کوئی موٹر سائیکل کا سائلنسر اتارے اسے تیز رفتاری سے چلا کر' کہیں آتش بازی کے ذریعے اور کہیں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بازاروں اور سڑکوں پر مادر پدر آزادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔ البتہ "کینال میلہ" دیدنی ہوتا ہے۔ نہر کے دونوں کناروں پر تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں کی تعداد میں مرد و خواتین امنڈ امنڈ کر آتے ہیں' رنگ برنگ روشنیاں دلفریب سماں پیدا کرتی ہیں' نہر میں فلوٹس پر بیٹھے مرد و زن دھنیں بکھیرتے' دلربا گانے سناتے اور آزادی ثقافتی ماحول کا مظاہرہ کرتے ہوئے تماشائیوں کے لئے خصوصی توجہ کا مرکز بنے رہتے ہیں۔

یہ ہے مذکورہ دو اہم تقریبات کے سلسلہ میں اظہار عقیدت و محبت کا انداز یکسر' ایک دوسرے سے مختلف لیکن ایک ہی قوم کی جانب سے۔ غالباً اسی لئے ہمیں زندہ دل کہا جاتا ہے کہ ہر رنگ میں اول ہوتے ہیں۔ تاہم اگر ہم پاکستانیوں کو اس موقع پر کوئی دو باتوں کا سامنا کر دے تو سوچنا ضرور پڑے گا کہ کیا جواب دیں۔ ۱۲ ربیع الاول کے موقع پر قومی سیرت کانفرنس میں صدر پاکستان کا یہ اعتراف کہ "غیر مسلموں نے رسول اکرمؐ کے مقرر کردہ اخلاقی معیار اپنا کر دنیا میں اپنی ساکھ قائم کر لی جبکہ ہماری نئی نسل دہشت گردی اور منشیات کی لعنت میں مبتلا ہے' ہمارا نظام تعلیم سیرت النبیؐ کی تدریس سے عاری ہے' قوم کو سیرت طیبہ کے مطابق تعلیم دی جاتی تو کراچی میں خون خرابہ نہ ہوتا"۔ ادھر یوم آزادی والہانہ جذبے سے منانے کے دوران قوم کو کوئی یہ یاد کرا دے کہ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء کو تو دو قومی نظریہ کی بنا پر دنیا کی سب سے بڑی مسلمان ریاست وجود میں آئی تھی۔ یہ مملکت خداداد کیوں ٹوٹی' تمہاری اکثریت نے تم سے الگ ہونے کا فیصلہ کیوں کیا؟۔ اس شکوے بلکہ طعنے کا جواب عوام کو کیا دیں گے وہ غاصب اور لٹیرے دیں جو تعداد میں تو آبادی کا صرف ۲۰ فیصد ہیں مگر قومی دولت کے ۴۵ فیصد پر قابض ہیں۔ کوئی غاصب ہے تعلیم کے میدان میں' کوئی صحت کے شعبہ میں' کوئی اقتدار کے حصول میں اور کوئی مراعات کے ذرائع میں۔ عزت و احترام کی خود بندھی پگڑی اپنے سروں پر سجانے والے بھی جواب دیں جو کرام' عظام اور ظل کے لاکٹ گلے میں لٹکائے اترائے رہتے ہیں کہ انہوں نے دانش کے موتی بکھیرنے کے سوا کیا کیا ہے۔ وہ کس منہ سے نبی اکرمؐ کا اقامت دین کے لئے سفر طائف کا ذکر کرتے ہیں اور کس منہ سے قائد اعظم کی قابل فخر قیادت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ○○

قیمت : ۶ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الھدیٰ

(سورۃ حم السجدہ' آیات ۳۳ تا ۳۶)

اور اس سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور خود بھی نیک عمل کرے

(کہ مختلف مقاصد کے لئے صدا لگانے والے تو بے شمار ہیں' کوئی اشتراکیت کی جانب لوگوں کو بلا رہا ہے' کوئی سرمایہ دارانہ نظام کا پرچارک ہے اور کوئی کسی اور ازم کی طرف لوگوں کو دعوت دے رہا ہے لیکن ان سب میں بہترین بلانے والا وہ ہے کہ جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلائے اور دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت کا نمونہ بننے کی بجائے خود بھی نیک طینت ہو اور نیک اعمال ہی کا صدور اس سے ہوتا ہو)۔

اور کہے کہ میں تو مسلمان ہوں○

(مقام دعوت پر فائز ہونے کے باوجود اس کے عجز و انکسار کا عالم یہ ہو کہ کوئی زعم اور دعویٰ رکھنے کی بجائے اپنے آپ کو عام مسلمانوں میں شمار کرے اور کسی فرقے کی طرف خود کو منسوب نہ کرے)۔

اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتے تو برائی کا دفاع اس طور سے کرو جو بہتر ہو

(اگرچہ عام دنیاوی قانون کے مطابق برائی کا بدلہ برائی سے دیا جا سکتا ہے' لیکن داعی حق کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ نفس کے جذبات سے مغلوب ہو کر کسی کی زیادتی کے جواب میں زیادتی کرنے والے کی سطح پر آ کر ویسا ہی طرز عمل اختیار کرے' بلکہ اس کے شایان شان تو یہ روش ہو گی کہ وہ گالی کے جواب میں دعا دے اور پتھر کے عوض پھول پیش کرے)۔

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

پس وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی' وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی جگری دوست○

(داعی حق کا یہ طرز عمل ہی تو دعوت کی راہ میں اس کا اہم ہتھیار ہے کہ اس کی ضرب سے بالآخر پتھر بھی موم ہو جائیں گے اور جانی دشمن بھی ایک دن جگری دوست اور جانثاروں کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے)۔

اور نہیں پہنچ پاتے اس مقام تک مگر وہی جنہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا اور نہیں رسائی حاصل کر پاتے اس مقام تک مگر وہی جو بڑے خوش نصیب ہیں○

(اس مقام بلند تک پہنچنے کے لئے اپنے پندار نفس کو خاک میں ملانا اور اپنے خون جگر کو جلانا پڑتا ہے اور یہ مقام رفیع ہر کسی کی قسمت میں کہاں! یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا)۔

اور اگر تمہیں کوئی شیطانی وسوسہ ورغلانے کی کوشش کرے تو فوراً اللہ کی پناہ پکڑو' وہی تو ہے جو سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے○

(اگرچہ اس مقام تک پہنچنے والا شیطان کے تمام حربوں کو ناکام بناتا ہوا یہاں تک پہنچتا ہے لیکن کسی موقع پر بھی ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر شیطان کی دستبرد سے محفوظ خیال کرے بلکہ اس بلند مقام تک پہنچنے کے باوجود اسے ہر وقت شیطان کی جانب سے چوکنا رہنا ہو گا اور جیسے ہی شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ اندازی ہو وہ فوراً اپنے سمیع و علیم رب سے پناہ طلب کرے کہ اس کے سوا اس کے لئے اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے)۔

جوامع الکلم

اگر اللہ تمہارے ذریعے کسی ایک شخص کو ہدایت عطا فرما دے تو یہ دولت تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے

(اگرچہ ہدایت دینے کا اختیار تو اللہ ہی کو ہے لیکن اگر کسی کی دعوت اور تبلیغ سے کوئی شخص راہ راست پر آ جائے تو مال کار کے اعتبار سے یہ اتنی بڑی کمائی ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت اس کے سامنے ہیچ ہے) (بخاری و مسلم)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

کل ماہ اگست کی ۱۴ تاریخ تھی۔ پاکستان بھر میں یوم آزادی پاکستان بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔ لاہور کی حد تک تو ہم نے بھی بچشم خود ہر سو پاکستانی پرچم اور پرچم ہی کے ڈیزائن پر بنی ہوئی جھنڈیوں کو لہراتے دیکھا۔ مینار پاکستان کے قریب سے گزرنے کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی لوگوں کا ہجوم اور اس کی جانب جوق در جوق رجوع دیدنی تھا۔ اہم شاہراہوں اور عمارتوں کو سجانے میں بھی ہم نے کوئی کمی نہیں کی' واپڈا ہاؤس کو دلہن بنے ہم نے بھی دیکھا' لیکن یہ سب کچھ دیکھ کر یہ سوال شدت کے ساتھ ذہن میں کلبلاتا رہا کہ اگر واقعی ہمارے عوام میں آزادی کا جذبہ صادق اور ولولہ و امنگ موجود ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کرنے سے قاصر رہے۔ ...ے ۲۴ برس ہمارا ایک بازو ___ نہیں ...ور انصف دھڑ ہم سے کٹ گیا اور مشرقی پاکستان میں ایک مسلمان بھائی کے ہاتھوں دوسرے مسلمان بھائی پر ظلم و ستم اور بربریت کے ہولناک ترین مناظر چشم فلک نے دیکھے۔ اور آج جب ہم نے اپنا ۴۸ واں یوم آزادی منا رہے ہیں ہم کسی بھی اعتبار سے "آزاد قوم" کہلانے کے حقدار نہیں۔ اپنی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہم نے کراچی میں حالات کو خرابی کی اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ کوئی معجزہ ہی اب ہمیں اس گرداب سے نکال سکتا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا معجزہ رونما نہ ہوا تو شدید اندیشہ ہے کہ خاکم بدہن اس بچے کھچے پاکستان کی سالمیت بھی برقرار نہیں رہ سکے گی! امریکہ کی کاسہ لیسی میں تو ہم پہلے بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے' تمام اہم معاملات میں ہماری حکومتیں آسمان امریکہ سے اترنے والی وحی پر لفظ بلفظ عمل کو واجب گردانتی تھیں' لیکن ابھی تک یہ سب کچھ درپردہ تھا' اب ہم نے علی الاعلان اپنے تمام مالی معاملات کی نکیل آئی ایم ایف کے ہاتھ میں تھما دی ہے کہ ملکی سطح کے تمام ادارے اب براہ راست آئی ایم ایف کے تحت کام کریں گے۔ گویا ہم صاف لفظوں میں اپنی نااہلی کا اعتراف کرتے ہوئے' کم از کم اقتصادی گوشے کی حد تک خود رضاکارانہ طور پر اپنی آزادی سے دستبردار ہو چکے ہیں۔ میں باز آیا محبت سے' اٹھا لو پاندان اپنا۔

دوسری جانب اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں اسلامی اقدار کا جنازہ جس طور سے نکالا جا رہا ہے اور سیکولرزم کی آندھی جس تیزی سے چڑھتی دکھائی دے رہی ہے یہ صورت حال دین و مذہب کے ساتھ خلوص و اخلاص کا رشتہ رکھنے والوں کے لئے نہایت تشویش ناک ہے۔

قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ پچھلے الیکشن کے موقع پر جب ملکی سیاست کے میدان میں مذہبی سیاسی جماعتیں مکمل طور پر ناک آؤٹ ہو گئی تھیں اور مسلم لیگ بھی مذہبی لبادہ اتار کر ایک بالکل سیکولر جماعت کے طور پر عوام کے سامنے آئی تھی' امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے حالات کے رخ کو دیکھتے ہوئے اپنے ایک خطاب جمعہ میں اس خدشے کا اظہار بالکل صاف الفاظ میں کیا تھا کہ اب اس ملک میں سیکولرزم کا ننگا ناچ ہو گا اور اسلام پسند دینی جماعتیں اس سیلاب کے آگے بند باندھنے میں بالکل ناکام رہیں گی---جس طوفان کی خبر امیر تنظیم نے دو سال قبل دی تھی وہ آج ہم پر مسلط ہو چکا ہے۔ کچھ دبی دبی احتجاجی صداؤں کے سوا کوئی موثر اور جاندار آواز اس طوفان کے خلاف بلند ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔

اس صورت حال پر جتنا بھی مرثیہ کہا جائے کم ہے' لیکن ایک زندہ قوم کے طور پر ہمیں اس دن کے حوالے سے کم از کم اپنے گریبانوں میں جھانکنا تو چاہئے کہ ہم نے ملک و قوم کی ترقی و استحکام کے لئے اپنے حصے کا کام کیا ہے یا نہیں! ہمیں آزادی جیسی عظیم نعمت جو اللہ کی طرف سے ملی تھی' کیا ہم نے اس نعمت کی کوئی قدر کی ہے یا آزادی کا ہم نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ دنیاداری اور دنیا پرستی میں ہم یہود و ہنود کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں!! کیا قیام پاکستان کے وقت ہم نے اللہ کے ساتھ جو عہد کیا تھا کہ اس خطہ زمین کو ہم ایک مثالی اسلامی ریاست بنائیں گے' اس عہد کا ایفاء ہم نے کیا ہے یا ہم مسلسل اس سے غداری ہی کے مرتکب ہوئے ہیں؟ اور کیا آج پاکستان جس ناگفتہ بہ صورتحال سے دوچار ہے یہ سب کچھ کہیں ہمارے اپنے کرتوتوں کا نتیجہ تو نہیں؟۔ جنرل (ر) محمد حسین انصاری صاحب نے بھی "حدیث امروز" میں ہمیں اپنے دلپذیر انداز میں اسی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ زیر نظر شمارے میں شامل اقتدار احمد مرحوم کی تحریر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اسی طرح عبدالکریم عابد صاحب کا فکر انگیز مضمون بھی تحریک آزادی کے حوالے سے ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتا ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل "ندا" میں اگست ۱۹۸۸ء میں شائع ہو چکا ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے اب ہدیہ قارئین ندائے خلافت کیا جا رہا ہے۔ OO

یا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

O

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر: اقتدار احمد مرحوم

جلد ۴ شمارہ ۳۴

۲۴ تا ۳۰ اگست ۱۹۹۵ء

مدیر: حافظ عاکف سعید

معاون مدیر: [illegible] احمد ملک

O

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴۔اے' مزنگ روڈ' لاہور

O

مقام اشاعت
۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون: ۵۸۶۹۵۰۱

O

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور

O

قیمت فی پرچہ: ۶/- روپے
سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) ۲۵۰/- روپے

O

زر تعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب' متحدہ عرب امارات' بھارت	۱۵ امریکی ڈالر
مسقط' عمان' بنگلہ دیش	۱۰ " "
افریقہ' ایشیا' یورپ	۱۲ " "
شمالی امریکہ' آسٹریلیا	۲۰ " "

دار ... ۱۹۹۵ء
17/8/95
10

ہماری جدوجہد آزادی کے نقائص :

جن کا خمیازہ ہم آج بھی بھگت رہے ہیں اور نہ جانے کب تک بھگتیں گے

مسلمان کے لئے اسباب دنیوی پر بھروسہ صحیح نہیں

عبدالکریم عابد کا بے لاگ تجزیہ

آزادی ثمر ہے جدوجہد آزادی کا اور جس قسم کی ہماری جدوجہد رہی ہے ویسا ہی ثمر ہمیں چکھنے کے لئے ملا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آزادی کے لئے ہماری قربانی کسی سے کم تھی' بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے آزادی کے لئے زیادہ قربانیاں دی ہیں اور زیادہ جوش و جذبہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس جدوجہد میں بعض بنیادی نقائص ضرور رہے ہیں اور ان نقائص کے اثرات ہمیں آزادی کے بعد دیکھنے اور بھگتنے پڑے۔ ان اثرات سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم پلٹ کر اپنی تاریخ کی طرف دیکھیں' اس سے سبق حاصل کریں اور آئندہ کے لئے جدوجہد کا جو بھی منصوبہ بنائیں وہ ان نقائص اور اس کے اثرات سے پاک ہو..... تاکہ تاریخ کے سفر میں جو بھی ہماری کوتاہی' محرومی اور کمی رہی ہے اس کا ہم واضح طور پر ادراک کر سکیں اور ازالہ کر سکیں' ورنہ صرف دل خوش کن حکایات کے کیف و سرور میں مگن رہنے سے آگے کی راہ روشن نہیں ہو سکے گی۔

ہماری جدوجہد آزادی پر ابتدا میں جو خیال حاوی رہا وہ یہ تھا کہ ہم اپنی عظمت رفتہ تلوار کے زور پر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس خیال نے جہاد کی تحریک کو جنم دیا' لیکن ہمارا رہنما طبقہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکا کہ مسلمانوں کی غلامی کا معاملہ سطحی اور سرسری نہیں ہے۔ یہ غلامی میدان جنگ کے چند معرکوں میں شکست کے بجائے مسلم معاشرہ کے اندرونی دیوالیہ پن کی مظہر ہے۔ یہ دیوالیہ پن ایمانی' اخلاقی' علمی' فکری' سیاسی' معاشی' معاشرتی ہر لحاظ سے انتہا پر پہنچ گیا تھا اور معاشرہ کی مکمل تباہی کے بعد یہ معاشرہ کسی جنگ میں کامیابی کا اہل نہیں رہ گیا تھا' جو قومیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں اور اپنی ایمانی و اعتقادی خصوصیات بھی کھو بیٹھتی ہیں ان کی تلوار ان کے لئے

مطالبہ پاکستان کو اجتماعی قیادت کے ذریعے ایسی شکل دی جا سکتی تھی کہ اس کا فائدہ یقینی اور نقصان کم ہو جاتا

فتح کی نوید نہیں بن سکتی اس تلوار سے صرف اپنا گلا کاٹا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں فرنگی راج کے خلاف جہاد کی کسی تحریک کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس جہاد کے لئے مردان کار میدان میں آئے جن کی زندگیوں میں صحابہؓ کا تقدس تھا' لیکن ترکستان ہو' افریقہ ہو' عالم عرب ہو یا برصغیر ہند' کسی بھی جگہ ان مقدس نفوس کے جہاد بالسیف سے ملی تقدیر بدل نہیں سکی' کیونکہ مسلم معاشرہ اپنی اصل تہذیب و ثقافت کھو بیٹھا تھا اور آخر میں اس کے پاس ایک بالکل ہی گلا سڑا نظام رہ گیا تھا۔ اس نظام کے حامل معاشرہ کو دوسروں کی دستبرد سے بچایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اس معاشرہ کی وہ تلوار ٹوٹ گئی تھی جو اس کا تحفظ کر سکتی تھی۔ یہ اصول آج بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اگر آپ کا نظام آپ کے حریفوں کے مقابلے میں مادی اور اخلاقی لحاظ سے گھٹیا ہے تو آپ کا بازوئے شمشیر زن کسی کام نہیں آئے گا اور تلوار پر یہ بھروسہ

ٹوڈی طبقہ کی قیادت سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا

نہ صرف رائیگاں جائے گا بلکہ اس کے معکوس نتائج آپ کے معاشرہ کو اپنی گرفت میں لے لیں گے۔ اس لئے پہلا جہاد ہر معاشرہ کا اپنا اندرونی جہاد ہوتا ہے اس مرحلے سے گزر کر اور نکھر کر ہی غیروں کے خلاف جہاد کے قابل بنا جا سکتا ہے مگر ہماری بدقسمتی یہ ہوئی کہ مسلم معاشرہ میں تغیر اور اصلاح کی تحریکوں کو کام کرنے اور پنپنے کے مواقع ہی نہیں ملے۔ جبر کی سیاسی فرماں روائی نے کسی نصب العین کی حرارت باقی نہیں رہنے دی اور معاشرہ حالات کے جبر پر راضی بہ رضا ہو کر انحطاط کے مراحل طے کرتا رہا اور یہ انحطاط جب کمال درجے کو پہنچ گیا تو خدا کی مشیت اس کی مقتضی ہوئی کہ دنیا کی امامت اور قیادت کا منصب کچھ دوسرے موزوں لوگوں کے سپرد کیا جائے۔ اس پس منظر میں تلوار کے زور پر اپنی نئی تقدیر تعمیر کرنے کا خیال شوق شہادت کی تکمیل کے لئے تو ٹھیک تھا لیکن اس سے کوئی تقدیر نو تعمیر نہیں ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کی طرح ہندو اور سکھ بھی ایک عرصہ تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ آزادی کی جنگ ہتھیاروں کے استعمال سے جیتی جا سکتی ہے۔ اس خیال نے ان میں بھی نام نہاد انقلابی اور دہشت پسند تحریکوں کو جنم دیا مگر اس دہشت پسندی کے ذریعے وہ فرنگی راج کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے اور بنگال سے لے کر پنجاب تک کے بارودی دھماکوں نے سرکار انگلشیہ کا بال بھی بیکا نہیں کیا اور رفتہ رفتہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ آزادی کے لئے جمہوری اور آئینی سیاسی جنگ کا مضبوط پلیٹ فارم اور قیادت حاصل کرنا ضروری ہے' خاص طور پر گاندھی نے عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے نام سے عوامی طاقت کو منظم کر کے جدوجہد آزادی کا موثر طریقہ سکھایا اور گاندھی کے اس طریق

کار یا قائداعظمؒ کی آئینی جنگ کے اس انداز کو اسی لئے قبول عام حاصل رہی کہ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ مسلح طاقت یا دہشت پسندی یا تخریب کاری کے ذریعے آزادی حاصل نہیں کر سکتے اور جس طرح مسلح جدوجہد' دہشت پسندی یا تخریب کاری' آزادی کے مقصد کے لئے بیکار تھی ایسے ہی آزادی کے بعد بھی یہ کسی نظام نو کی تعمیر یا حقوق و مفادات کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ نظام باطل کے مقابلے میں صرف نظام حق کامیاب ہو سکتا ہے اور دوسروں کے پاس باطل کا عنصر جتنا زیادہ ہوگا اور آپ کے پاس حق کی طاقت جتنی زیادہ ہوگی' اتنی ہی آپ کی کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں گے لیکن آپ کا باطل دوسروں کے باطل سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے اور حق کا سرمایہ آپ دوسروں سے کمتر رکھتے ہیں تو محض قومی غیرت کو للکار کر یا مجاہدانہ نعرے لگا کر میدان نہیں جیتا جا سکتا۔ اس لئے قومی آزادی کی تحریکوں کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے باطن کی دنیا میں ایسا تغیر پیدا کریں جو ان کے ظاہر کو بھی نیا بنا دے اس تغیر سے گزر کر ہی انہیں مخالف اور مقابل طاقتوں سے لڑنے' بھڑنے اور ٹکرانے کی طاقت حاصل ہوگی ورنہ وہ بس ایک غدر برپا کر کے رہ جائیں گے۔

غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ

جب قومیں ہتھیاروں پر بھروسہ کرتی ہیں اور ہتھیار کام نہیں آتے تو اس کا ایک رد عمل شکست خوردہ اور غلامانہ ذہنیت کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس رد عمل نے ہمارے مسلم معاشرہ اور اس کی تحریکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے اولین مظہر سرسید تھے۔ سرسید نے دیکھا کہ برطانوی حکومت کا مقابلہ مسلمانوں کے بس کی بات نہیں تو انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہمیں انگریزی حکومت اور انگریزی کلچر کی بالادستی تسلیم کر کے اس کے آگے گھٹنے ٹیک دینے چاہئیں۔ اس طرز فکر کے پیچھے چونکہ ہماری اجتماعی شکست کے حقائق اور مناظر تھے اس لئے اسے مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکار انگلشیہ کا ایک وفادار طبقہ مسلم سیاست میں آگے بڑھا۔ اس طبقہ نے یہ بھی محسوس کیا کہ براوران ہنود کی جانب سے اس کے

رومانویت اور جذباتیت نے سیاسی حقائق کو نظرانداز کر دیا

مستقبل کو کچھ خطرات لاحق ہیں' ان خطرات کے مقابلہ کے لئے برطانوی حکومت کی پناہ میں آنا ضروری ہے' لیکن اس طرح کی مسلم سیاست سے مسلمانوں کی قیادت پر ایک ٹوڈی طبقہ قابض ہو گیا۔ اس کی سیاست بس یہ تھی کہ جب بھی ہندو قیادت ہندوستان کے حقوق اور مفادات کا تذکرہ کرے تو اس کے مقابلے پر یہ مسلم حقوق اور مفادات کا قضیہ کھڑا کر دیں تاکہ انگریز کو اس ہندو قیادت سے نبٹنے میں ایک سہولت ہاتھ آئے۔ سر سید' محسن الملک' وقار الملک' آغا خان' راجہ آف محمود آباد اور دوسرے مسلم لیڈروں کی مسلم سیاست کا ماحصل یہی تھا کہ مسلمانوں کو سمجھایا جائے کہ انگریز ایک بڑی طاقت ہے اس سے لڑ کر کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ لڑنا ہے تو ہندو سے لڑو اور برطانوی حکومت کے وفادار بن کر برطانوی حکومت سے ہندو کے مقابلے میں اپنے لئے حق نیابت

کانگریس کے برعکس مسلم لیگ کا پلیٹ فارم سیاسی جامعیت سے یکسر خالی تھا

اور ملازمت طلب کرو۔

اس ٹوڈی طبقہ نے مغرب سے تحصیل علم کے معاملے میں بہت سطحی اور اوچھے رویہ کا مظاہرہ کیا۔ ہندوستان میں مغربی تعلیم مسلمانوں نے بھی حاصل کی اور ہندوؤں نے بھی' لیکن مغربی تعلیم کا نتیجہ دونوں پر متضاد نوعیت کا رہا۔ مسلمان کو مغربی تعلیم نے ذہنی غلامی' مغربی ظواہر اور فیشن کی اندھی تقلید' عوام الناس سے کٹ جانے اور اپنی تاریخ یا اقدار کو فراموش کرنے کا سبق دیا۔ لیکن ہندو کے لئے مغربی تعلیم نے ذہنی بیداری کی نئی راہ کھولی' اسے قومی تہذیب' سادگی اور کفایت شعاری کا درس دیا اور وہ مغربی تہذیب کے ظاہر میں کھو جانے کے بجائے اس کے باطن کی تہہ تک پہنچ کر قوم پرستی اور جمہوریت نکال لایا۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ مغربی تعلیم مسلمانوں کے لئے زہر اور ہندو کے لئے امرت کیوں بن گئی۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں' لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مغربی تعلیم کی جانب ہماری پیش قدمی ٹوڈی طبقہ کی

مغربی تعلیم مسلمان کے لئے زہر' ہندو کے لئے امرت بن گئی

قیادت میں ہوئی' جبکہ ہندوؤں نے اپنے ان مصلحین اور ریفارمر کے زیر اثر مغرب سے رجوع کیا جو مغرب کے ذہنی غلام اور برطانوی حکومت کی وفاداری کا دم بھرنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ہندو سوسائٹی میں اپنے اجتماعی آدرش زندہ رکھے۔ ٹوڈی طبقہ کی مسلم سیاست میں اگر کوئی اجتماعیت تھی بھی تو وہ ملازمتوں کے تناسب اور کونسلوں کی ممبریوں کے حوالے سے تھی۔ وہ مسلم معاشرہ میں کوئی اونچا اور اعلیٰ نصب العین زندہ و تابندہ نہیں رکھ سکے۔ قیادت کے معیار' کی اس پستی نے سیاست سے لے کر تعلیم تک ہر شعبے میں لوگوں کے سامنے صرف پست مقاصد رکھے اور انہیں اونچا اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

مسلمانوں کے اس طبقہ میں سرسید ایک نمایاں آدمی تھے وہ جرات اور حوصلہ بھی رکھتے تھے لیکن خود ان کا بھی یہ حال تھا کہ ایک جگہ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مجھ کو نہایت خوشی ہوتی ہے اگر میرے آقا نے میری نسبت کچھ بات کہی ہو۔ میں کیوں نہ اس کو کہوں اور کس لئے نہ لکھوں کہ اپنے آقا کی بات سے خوش ہونا اور اس کو بیان کر کے فخر کرنا نوکر کا کام ہے' یعنی جب میں میرٹھ آیا اور بیماری نے مجھ کو کمال ستایا تو میرے آقا مسٹر جان کیری کرافٹ ولسن صاحب بہادر دام اقبالہ' سپیشل کمشنر میری عزت بڑھانے کو مجھے دیکھنے آئے اور مجھ سے یہ بات کہی کہ تم بڑے نمک حلال نوکر ہو۔ تم نے نازک وقت میں بھی سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا"۔ (مقالات سرسید حصہ ششم صفحہ ۳۵۲)

سرسید کا یہ حال تھا کہ انگریزی حکومت ہی نہیں انگریزی حکومت کے ایک افسر سے اتنی مرعوبیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ سرسید کے علاوہ ان کا جو طائفہ ہے وہ تو اس معاملے میں بہت ہی آگے بڑھا ہوا تھا۔ اس ذہنیت کی قیادت کوئی آزاد ذہن یا روح پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اول دن سے جو ٹوڈی طبقہ مسلم سیاست میں داخل ہوا ہے وہ آج تک اس کا جزو لاینفک اور جزو اعظم ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوؤں نے اپنی نمائندگی کے لئے راجوں مہاراجوں یا رائے بہادروں کو آگے نہیں بڑھایا۔ متوسط اور غریب طبقہ کے افراد کانگریس کی قیادت پر آئے تھے اور وہ

کسی احساس کمتری کے بغیر حکمران طبقے اور دولت مند طبقے سے بات کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں سیاست دولت مندوں کے لئے مخصوص ہو گئی۔ اس پر علامہ شبلی نے تنقید بھی کی اور کہا کہ اگر تم لیگ کو صحیح معنوں میں عوام کی مسلم لیگ بنانا چاہتے ہو تو اپنی کونسلوں کو بڑے بڑے زمینداروں' تعلقہ داروں سے خالی کرا لو اور کانگرس کو دیکھو کہ اسے اپنے لئے ... 'نقرئی مقروں کی ضرورت مطلق نہیں ہوتی ہے۔

مسلمانوں کی عوامی تحریکیں

تحریک خلافت کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نوابی قیادت پیچھے چلی گئی اور انقلابی فکر و نظر رکھنے والے لوگ سامنے آئے اور انہوں نے عوام کو بھی متحرک کیا لیکن تحریک خلافت کے سامنے عرب' افریقہ اور ترکی کے ناتواں وجود کو سہارا فراہم کرنے کا مقصد تھا' اس مقصد کو تحریک خلافت نے پورا بھی کیا لیکن برصغیر کے مسلمانوں کے داخلی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی اسے مہلت نہ ملی۔ ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں تحریک خلافت کے رہنماؤں نے صرف خواب دیکھا تھا اور اپنی زندگی میں ہی اس خواب کی الٹی تعبیر برآمد ہوتے بھی دیکھ لی تھی۔ نہرو رپورٹ نے رہنمایان خلافت کو سخت مایوس کیا۔ اس سے ہندو مسلم اختلافات شدت سے سامنے آئے۔ یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ ہندو مسلم اتحاد کے خواہش مند رہنماؤں نے فرقہ وارانہ مسئلہ کی نزاکت کو نہیں سمجھا۔ وہ ان باتوں کو صرف یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ انگریز ہمیں لڑانا چاہتا ہے' لیکن اس سے ہندو مسلم ٹکراؤ کا مسئلہ حل نہیں ہوتا تھا۔ یہ ٹکراؤ درحقیقت موجود تھا اور روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ٹکراؤ میں اس اضافہ نے ہی مسلم لیگ کو طاقتور بنایا۔ تحریک خلافت' مجلس احرار اور خاکسار تحریک نے یقیناً مسلمانوں میں ایک نئی انقلابی روح پھونکی لیکن ان جماعتوں کے انداز میں حقیقت پسندی کی بجائے جذباتیت کا غلبہ رہا۔ جمعیت العلمائے ہند جذباتیت کا شکار نہیں تھی لیکن وہ اس قدر سنجیدگی اور تعطل پسندی کا شکار ہو گئی تھی کہ عوامی جذبات سے رشتہ نہیں رکھ سکی اور کٹ کر رہ گئی۔ اس طرح ایک دور ایسا رہا جس میں مسلم

سیاست میں ناشائستگی کا سبق لیگی لیڈروں نے دیا

سیاست میں جوش تھا لیکن جوش کے تناسب سے ہوش نہیں تھا۔ ہنگامہ پسندی' انقلابیت اور رومانویت تھی مگر سنجیدہ حقائق کو دیکھنے کی جانب طبیعت مائل نہیں ہوئی یا پھر جمعیت العلمائے ہند کا کٹر تو ہب پسند اور خشک ذہن تھا جس نے عوام کے جذبات اور احساسات کے عالم اسفل کو دیکھ کر نفرت و حقارت سے منہ پھیر لیا اور مسلم عوام کے ذہنی میلانات' تحفظات اور تعصبات سے کوئی رابطہ رکھنا پسند نہیں کیا۔ اس سے پہلے ایک تحریک ہجرت کے نتیجے میں سینکڑوں ہزاروں سیاسی ذہن رکھنے والے افراد نے افغانستان ہجرت کی لیکن یہ ہجرت بھی بے مقصد ثابت ہوئی اور

> **علمائے دین نے عوام کے ذہنی میلانات' تحفظات اور تعصبات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی**

یہ جذباتی اقدام لوگوں کے لئے ذاتی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر ... جانے کا سبب بنا۔ تحریک عدم تعاون میں مسلم طلبہ کو تعلیمی اداروں سے نکل جانے اور سرکاری ملازموں کو ملازمتیں چھوڑ دینے' وکیلوں کو وکالت ختم کر دینے کا لائحہ عمل دیا گیا مگر یہ بھی ایک انتہا پسندانہ جذباتی لائحہ عمل تھا اور اس پر زیادہ دیر تک عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دراصل اس طرح کی رومانویت انتہا پسندی اور انقلابیت نے ہی یہ احساس پیدا کیا کہ ایک ایسی جماعت اور قیادت کی ضرورت ہے جو حقیقت پسند ہو اسی سے مسلم لیگ کے لئے راستہ صاف ہوا۔

مسلم لیگ کی سیاست

مسلم لیگ کی سیاست مسلمانوں کے فرقہ وارانہ حقوق اور مفادات کے لئے تھی۔ مطالبہ پاکستان بھی اس ضمن میں سامنے آیا اور بعد میں ایک خالص اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کی آرزو بھی اس میں شامل ہو گئی۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال ؒ کی شاعری اور مولانا مودودی کی تصانیف نے اہم کردار ادا کیا۔

قائد اعظم ؒ کے ساتھی قائد کے ڈسپلن میں نہیں تھے

مولانا مودودی اگرچہ کہ تحریک پاکستان کے حامی نہیں تھے لیکن مسلم لیگ نے انہی کے لٹریچر سے اپنے لئے نظریاتی اساس حاصل کی مگر مسلم لیگ نے یہ نظریاتی اساس صرف منطق اور استدلال کی ضروریات کے لئے حاصل کی تھی' ورنہ اس کا بنیادی مزاج اسلام کی بجائے مسلم قوم پرستی سے تیار ہوا تھا۔ مولانا مودودیؒ نے اس مسلم قوم پرستی کو اپنی بے رحمانہ تنقید کا نشانہ بنایا اور کہا کہ ہندو قوم پرستی کی طرح یہ مسلم قوم پرستی بھی ایک ناجائز چیز ہے۔ جہاں تک جمعیت العلمائے ہند' مجلس احرار وغیرہ کا تعلق تھا وہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مسئلہ سے بے خبر نہیں تھے لیکن پاکستان کو اس لئے اس مسئلہ کا حل نہیں سمجھتے تھے کہ مسلم اقلیتی ہندوستان میں جو مسلم تہذیب کا مرکز ہے پاکستان سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا بلکہ اور نقصان ہو گا جبکہ مسلم اکثریتی علاقے میں مسلم اکثریت کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ علماء کا طبقہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ ہندو کا خطرہ موجود ہے لیکن وہ کہتے تھے کہ پہلے انگریز کو جانے دو پھر ہم ہندو سے نبٹ لیں گے۔ انگریز کا ہندوستان سے جانا عالم اسلام سے فرنگی کا بوریا بستر گول کرنے کا سبب بنے گا۔ اس لئے ہمیں اصل توجہ انگریز کے نکالنے پر رکھنی چاہئے۔ طبقہ علماء کے خیال میں اسلامی نظام کی آرزو بھی خیال خام تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کے مسلم معاشرہ میں اور اس کی قیادت میں اسلامی نظام قائم کرنے یا چلانے کی اہلیت نہیں ہو گی۔ یہ ملک بن گیا تو سامراج طاقت کا اڈہ ہو گا۔ تاہم مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں یہ بزرگ اگر حق بجانب تھے تو بھی انہوں نے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی موثر اور اطمینان بخش طریقہ اختیار نہیں کیا۔ وہ اس مسئلہ کو یا تو نظرانداز کر رہے تھے یا اس کے لئے کانگرس کی کاغذی ضمانتوں کو کافی سمجھتے تھے۔ کوئی ایسا آئینی نظام یا نقشہ انہوں نے لوگوں کے سامنے نہیں رکھا جس میں فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل موجود ہو۔ اس لئے فرقہ واریت بڑھتی چلی گئی اور تقسیم پر منتج ہوئی۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب آبادی کا ایک حصہ خوف و خدشات کا شکار ہو تو اس کیفیت کو نظرانداز کرنے سے کام نہیں چلتا۔ محرومی' خوف یا نفرت کی نفسیات آخر کار ٹکراؤ اور تقسیم کے عمل کے سامنے مسلمانوں کی غیر مسلم لیگی جماعتیں

بے بس ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس عمل کو روکنے کے لئے ان کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ دوسری طرف لیگ کا مطالبہ پاکستان کتنا بھی حق بجانب سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مطالبہ پاکستان سے بدترین قسم کی فرقہ واریت کو ہوا دی گئی اور ہندو مسلم کشمکش یا منافرت کو انتہا پر پہنچا دیا گیا حالانکہ یہ بات طے تھی کہ کروڑوں مسلمانوں کو پاکستان بن جانے کے بعد بھی ہندوؤں کے ساتھ ہی رہنا' بسنا اور گزر کرنا تھا۔ اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمان قوم ایک داعی قوم ہے اور اسلام کی جانب ہندوؤں کو دعوت دینے کے لئے باہمی خیر سگالی اور رواداری کی فضا ضروری تھی۔ دراصل برہمن کی سازش یہی تھی کہ ہندوؤں میں اسلام سے ایک مستقل نفرت قائم کی جائے۔ اس غرض کے لئے فرقہ واریت کو ہوا دی جائے۔ ہندو فرقہ واریت کے جواب میں مسلم فرقہ واریت کو ہوا دے کر برہمن کے مقاصد کو پورا کیا گیا' جو ہندوؤں کی اسلام اور مسلمانوں سے دوری چاہتا تھا۔ پھر ہندو سے نفرت کی یہ سیاست کوئی مثبت چیز نہیں تھی اور پاکستان کے حالات میں صرف اس جذبہ نفرت کی بنا پر باہمی تضادات کو ابھرنے سے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے لئے مثبت نظریہ اور اقدار کی ضرورت تھی لیکن لیگی قیادت کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ وہ مسلم قوم پرستی کے منفی وجود کو بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

مسلم لیگی سیاست کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ سیاست میں عدم رواداری اور ناشائستگی نے فروغ پایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد" اور مولانا حسین احمد مدنی" کے ساتھ جو پرلے درجے کی بدتمیزیاں کی گئیں اس پر کسی مسلم لیگی لیڈر نے افسوس کا کلمہ تک نہیں کہا نہ لیگی قیادت کے ضمیر نے اس پر کوئی شرمندگی محسوس کی۔ سچ پوچھئے تو اخلاق باختہ سیاست کا آغاز مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہوا اور یہی وہ چیز تھی جو بعد میں پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے ظاہر ہوئی۔

مسلم لیگ نے اگر پاکستان صحیح بنایا تو یہ بھی طے ہے کہ اس پاکستان کے لئے کوئی صحیح قیادت مسلم لیگ نے فراہم نہیں کی۔ لیگی قائدین کا یہ حال تھا کہ فضل الحق نے جلسہ عام میں کہا کہ اگر اقلیتی علاقے میں مسلمانوں سے برا سلوک ہو گا تو وہ مسلم بنگال میں ہندوؤں کا قتل عام کرا دیں گے۔ اس پر جلسہ میں ہی انہیں شیر بنگال کا خطاب دیا گیا' جلسہ سے واپسی کے بعد جب وہ اپنے ہندو رفقاء کار کے پاس پہنچے تو کہا کہ میں نے تو لوگوں کو بیوقوف بنایا ہے ورنہ ہمارا ہندوستانی مسلمانوں سے کیا واسطہ' وہ جہنم میں جائیں' ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ یہی حال سہروردی کا بھی تھا کہ مسلمانوں کے سامنے ان کی سیاست کچھ تھی اور ہندوؤں کے سامنے کچھ۔

مغربی پاکستان میں جو لوگ قائد اعظم کے ساتھ تھے وہ تمام تر ٹوڈی طبقہ کے لوگ تھے ان کا یہ حال تھا کہ بمبئی میں قائد اعظم کی قیادت میں فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگ کے ممبر "وار کمیٹیوں" میں شامل نہیں ہوں گے لیکن یہ فیصلہ کر کے جب سر سکندر حیات' نواب ممدوٹ' سر شاہنواز' میاں گورمانی' راجہ غضنفر علی خان' سید امجد علی اور میاں امیر الدین لاہور پہنچے تو انہوں نے پنجاب "وار بورڈ" کے اجلاس میں شرکت کی اور گورنر کے حکم پر وار کمیٹیوں کی تشکیل میں مصروف ہو گئے۔ اس پر اخبار نویسوں نے سوالات کئے تو سر سکندر حیات نے کہا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلم لیگیوں کو مسٹر جناح نے اس قرارداد کی پابندی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔ اس پر قائد اعظم کا بیان آیا کہ سر سکندر کا بیان غلط ہے' کسی کو مستثنیٰ قرار نہیں دیا گیا۔ اس کے باوجود پنجاب کے مسلم لیگی لیڈر من مانی کرتے رہے۔

> **جو قومیں زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں اور اپنی ایمانی و اعتقادی خصوصیات کھو بیٹھتی ہیں ان کی تلوار ان کیلئے فتح کی نوید نہیں بن سکتی اس تلوار سے صرف اپنا گلا کاٹا جا سکتا ہے**

قائد اعظم نے پنجاب مسلم لیگیوں کو مسلم لیگ نیشنل گارڈ بنانے کا حکم دیا۔ اس حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور مسلم لیگ کے پارلیمنٹری سیکرٹری راجہ غضنفر علی خان نے بیان جاری کیا کہ ہم مسلم لیگی نیشنل گارڈ بنانے کی تجویز سے متفق نہیں ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ مسٹر جناح نیشنل گارڈ کی اس تجویز کو ترک کر دیں ورنہ پھر انہیں یہ شکایت ہو گی کہ اہل پنجاب مسلم لیگ کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔

پنجاب پر ہی منحصر نہیں' بنگال' سندھ' یوپی کسی جگہ بھی قائد اعظم کی حکم عدولی سے دریغ نہیں کیا جاتا تھا اور من مانی ہوتی تھی۔ پنجاب میں سکندر حیات' سندھ میں جی ایم سید وغیرہ' بنگال میں فضل حق' یوپی میں خلیق الزمان قائد اعظم کے لئے مستقل مسئلے پیدا کرتے رہتے تھے۔ تمام لیڈر اپنے قائد کی بجائے سرکار برطانیہ کی طرف دیکھتے تھے اور وہاں سے جو اشارہ ملتا تھا اس کے مطابق کرتے تھے اور یہی وہ قیادت تھی جو پاکستان بننے کے بعد اس کے حصے میں آئی۔

مسلم لیگی لیڈروں کو قیام پاکستان کے بعد فسادات کے متعلق بھی کچھ اندازہ نہیں تھا حالانکہ فساد کی تیاریاں بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھیں۔ مگر وہ اس سے غافل یا لاپروا رہے اور لوگوں کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ مسلم لیگی قیادت کو یہ خبر بھی نہیں تھی کہ پنجاب اور بنگال تقسیم ہو گا حالانکہ اس تقسیم کے بیج ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان میں ہی مستور تھے۔ چودھری خلیق الزمان کا کہنا ہے کہ عین وقت پر قرارداد بدل کر یہ قرارداد پراسرار انداز سے سامنے رکھ دی گئی اور لوگوں نے بلا سوچے سمجھے یا مجبوری کی حالت میں اس کی تائید کی۔ چودھری خلیق الزمان "شاہراہ پاکستان" میں لکھتے ہیں "میں آج ۲۶ برس قبل کی اس قرارداد کے الفاظ کو غور سے پڑھتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم چلے تھے کل صوبہ پنجاب کا دعویٰ کرنے اور ہم نے اپنے عرضی دعوے میں اپنا پچاس فیصد دعویٰ قلم زد کرا دیا"۔

قائد اعظم اپنی جگہ بہت مخلص تھے لیکن ان کے ارد گرد جو ٹوڈی طبقہ تھا وہ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کو اپنے انداز سے چلاتا تھا اور قائد اعظم اس وقت کے حالات کی وجہ سے انہیں نظر انداز کرنے یا گوارا کرنے پر مجبور تھے۔ انہی ناگوار چیزوں میں ایک سکندر جناح پیکٹ تھا جس کا صدمہ علامہ اقبال کو وفات سے کچھ قبل سہنا پڑا۔ عاشق حسین بٹالوی تو کہتے ہیں کہ یہی صدمہ ان کی موت کا سبب بنا۔

ذمہ دار کون ہے؟

جو کچھ ہوا وہ مسلم سیاست کے حالات کا منطقی

مسلم قوم پرستی نے اسلام کو پھیلنے سے روک دیا

نتیجہ تھا۔ اس کے لئے کسی ایک فرد کو یا ایک جماعت کو قصور وار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ مسلم سیاست کی ابتدا ہی غلط تھی۔ ایک طرف ہمارے آزادی پسند علماء تھے جو اپنی نظریاتی شدت اور انتہا پسندی کی وجہ سے مسلم عوام سے کٹ گئے دوسری طرف ٹوڈی طبقہ تھا جو مسلم مفادات اور حقوق کا چیمپئن بن کر ظاہر ہوا اور اپنا کھیل کھیلتا رہا۔ اس کے مقابلے میں ہندو قیادت نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر اپنے مذہبی' سیکولر' متعصب روادار' انقلابی اور ٹوڈی تمام عناصر کو جمع کر دیا اور گاندھی حسب ضرورت ان میں سے جس مہرہ کو چاہتے تھے استعمال کرتے تھے اور اپنی سودے بازی کی قوت کو قائم رکھتے تھے۔ ہندو قیادت خواہ انقلابی تھی خواہ رجعت پسند' لیکن حقیقی قیادت تھی اور ہندو معاشرہ سے ابھر کر آئی تھی اور عوام میں اس کی جڑ تھی۔ اس ہندو قیادت کے پیچھے ریفارم کی تحریکیں تھیں اور ان تحریکوں نے ہندو معاشرہ کی قلب ماہیت کر دی تھی۔ خود گاندھی نے صرف ایک سیاسی لیڈر کا نہیں بلکہ ریفارمر کا کردار بھی ادا کیا۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی قیادت میں صرف سرکار پرست طبقہ رہا اور جو سرکار پرست نہیں تھے ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور وہ صرف دکھاوے کی چیز تھے۔ پالیسیوں پر وہ اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے اور نہ لیگ کو نئے ذہن اور مزاج کی قیادت دے سکتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ اور جمعیت العلمائے ہند کے درمیان اتحاد ہوا تھا۔ اس اتحاد کا جس کا نظریہ تھا کہ قائد اعظم نے رہنمایان جمعیت سے فرمایا تھا کہ وہ ٹوڈی لوگوں میں پھنس گئے ہیں' ان سے نجات چاہتے ہیں اور آزاد خیال لوگوں کو اوپر لانا چاہتے ہیں۔ اس کام کے لئے جمعیت کے تعاون کی ضرورت ہے چنانچہ تعاون کا سمجھوتہ ہوا مگر افسوس کہ یہ سمجھوتہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ اگر یہ سمجھوتہ قائم رہتا اور مسلم لیگ کی قیادت میں عوامی اور انقلابی عنصر داخل ہوتا تو لیگ کی صورت کچھ اور ہوتی لیکن ایک دوسرے پر الزام تراشی اور تلخ بیانی اور عدم رواداری کی وجہ سے دوری کم ہونے کی بجائے بڑھتی چلی گئی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان تو ضرور حاصل کر لیا گیا لیکن پاکستان کے لئے کوئی ایسی قیادت نہیں مل سکی جو ٹوڈی طبقہ کا جواب ہوتی اور اسے اپنی کارروائیوں سے روک سکتی۔ اس عدم مصالحت کے رویہ کے لئے مسلمانوں کی تمام جماعتوں کے ذمہ دار عناصر برابر کے قصور وار ہیں۔ کسی نے اپنے رویہ میں لچک نہیں رکھی اور ایک دوسرے کے ہم قدم ہونے یا مطابقت پیدا کرنے کی کوئی اور کوشش سرے سے ہی نہیں کی گئی۔ اس وجہ سے ہمارے رہنماؤں کے کٹر ذہن' رویہ اور ان کی ضد انانیت کی تسکین کا سامان تو ہو گیا لیکن نئے ملک کو جس نئی اجتماعی قیادت کی ضرورت تھی وہ مفقود ہو گئی اور ہم آج تک اس قیادت سے محرومی کی سزا بھگت رہے ہیں۔

اگر لیگ کے پلیٹ فارم پر یہ اجتماعی قیادت ہوتی تو مطالبہ پاکستان کے لئے مطلوبہ فائدوں کو یقینی صورت دی جا سکتی تھی اور اس کے ساتھ یہ اہتمام بھی ہو سکتا تھا کہ اس کے نقصانات کم سے کم ہو جائیں لیکن فرد واحد کی قیادت میں زیادہ کچھ اس لئے ممکن نہیں تھا کہ ایک فرد کی اپنی محدودیت اور مجبوریاں ہوتی ہیں۔ وہ خاص حد سے آگے نہیں جاتا۔ اگر کانگریس میں بھی کوئی ایک ہی فرد ہوتا اور باقی ناقابل ذکر لوگ ہوتے تو کانگریس بھی آزادی کے بعد قیادت کے خلا کا باعث ہوتی مگر ہندو قوم نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ فرد واحد خواہ وہ دیوتا جیسا کیوں نہ ہو قوم کے لئے کافی نہیں اور ایک اجتماعی قیادت کے بغیر کسی قوم کا سیاسی ارتقاء نہیں ہو سکتا۔ OO

توجہ طلب

موسمی تغیرات اور بندۂ مومن کا ردعمل!

میم سین' کراچی

ہم بتدریج مغربی تہذیب کو گلے لگا رہے ہیں

حالات کی سنگینی کے باوجود کراچی میں ساحل سمندر پر تفریح کے نام پر فحاشی کا سیلاب

بادل کا رنگ دیکھ کر طبیعت کا مچل جانا صرف شاعرانہ تعلی ہی نہیں حقیقت واقعہ بھی ہے' فرق صرف یہ ہے کہ شاعرانہ تعلی میں مبالغہ آمیزی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ موسمی تغیرات کا انسانی طبیعتوں پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ غور کی بات یہ ہے کہ مومن کا ردعمل ایسے مواقع پر کیسا ہونا چاہئے۔ کائنات کی دیگر نعمتوں کی طرح برسات بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کراچی جیسے شہر میں نکاسی آب کی خراب صورت حال کی بناء پر عوام کے لئے اللہ کی یہ نعمت بھی زحمت کا باعث بن جاتی ہے۔

اگر مومن کو اللہ تعالی کی جانب سے کوئی نعمت عطا ہو تو اس کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ آیئے ہم قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورۂ حدید میں ارشاد باری تعالی ہے لکیلا تاسوا علی ما فاتکم ولا تفرحوا بما آتکم واللہ لا یحب کل مختال فخور "تاکہ تم افسوس نہ کرو اس پر جو (چیز) تم سے جاتی رہے اور نہ اتراؤ اس پر جو تمہیں عطا کی جائے' اللہ کسی شیخی بگھاڑنے والے اور اکڑنے والے کو پسند نہیں فرماتا"۔

برسات کے موسم میں ساحل سمندر پر تفریح

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

ایں گل دیگر شگفت

کیا قائداعظم پاکستان کو لادین ریاست بنانا چاہتے تھے؟

قائداعظم کے فرمودات میں "سیکولرازم" ڈھونڈنے والے ان کا قد کاٹھ بڑھا نہیں رہے، گھٹا رہے ہیں

یوم آزادی پاکستان کی مناسبت سے "ندائے خلافت" کے بانی مدیر مرحوم اقتدار احمد کی ایک یادگار تحریر

اب تک اس خیال کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ قائد اعظم علیہ رحمت کا ارادہ پاکستان کو نمونے کی ایک اسلامی ریاست بنانے کا تھا۔ البتہ ایک محدود اقلیت ان کے بعض اقوال بالخصوص نئے ملک کی دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں ان کی تقریر کے چند جملوں کو ایک خاص مفہوم دے کر یہ دعویٰ کرتی ہے کہ قائد اعظم نے واضح طور پر پاکستان کو ایک سیکولر سٹیٹ کی شکل دینے کا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ تاہم اس دعوے کو پذیرائی حاصل نہیں ہو سکی کیونکہ معمار پاکستان کے اس نوع کے فرمودات بہت بڑی تعداد میں محفوظ ہیں کہ ہم پاکستان کو اسلام کے اصول اخوت و حریت و مساوات کا ماڈل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں یا یہ کہ مجھ سے پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا آئین کیا ہو گا اور میرا جواب یہ ہے کہ وہ تو قرآن کی شکل میں ہمارے پاس پہلے سے موجود ہے، وغیرہ... اور اس حقیقت سے تو کسی کو بھی انکار کی مجال نہیں کہ تحریک حصول پاکستان آخری مرحلے میں اپنی کامیابی کے لئے اس نعرے کی مرہون منت ہے جس کی گونج خیبر سے راس کماری تک سنائی دی گئی کہ "پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ"۔

جنگ آزادی میں صحافتی محاذ پر داد شجاعت دینے والے قائد اعظم کے سپاہی زیڈ اے سلہری جنہیں "مائی لیڈر" سے قربت کی سعادت اور ان کی براہ راست ہدایات کے تحت کام کرنے کا موقع ملا اور جو آج تک ان کی محبت و عقیدت کے نشے سے سرشار ہیں، پہلے "پاکستانی قومیت" کے چیو کی مدد سے ملک خداداد کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کی وکالت کیا کرتے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے وہ اس اعتراف پر مجبور ہو چکے ہیں کہ خود قائد اعظم بھی اسی مسلم قومیت کے علمبردار تھے جس کی بنیاد اسلام پر تھی اور ہے۔ ۳۱/ جولائی کے "جنگ" لاہور میں "ہم نے کہاں ٹھوکر کھائی؟" کے زیر عنوان اپنے کالم "مسائل و افکار" میں ایک بار پھر انہوں نے کھل کر اپنے تازہ موقف کی وضاحت کی ہے۔ پورے کالم کا رنگ یہی ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے ہو جائے گا:

"اس محاذ آرائی میں اسلام نمایاں طور پر سامنے آیا کیونکہ اس صورت میں یہ ایک مذہبی تنازع بن کر ابھرا کہ آیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک قوم بنتے ہیں یا وہ ایک الگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور چونکہ یہ بات پاکستان کے جواز میں ایک اہم تنازع کی حیثیت رکھتی تھی اور اس پر پوری تفصیل کے ساتھ تیز و تند انداز میں بحث ہو چکی تھی لہٰذا اس بحث میں اسلام کو مرکزی حیثیت حاصل تھی چنانچہ اس کے تھمنے میں پورے سات سال صرف ہو گئے۔ ایسی صورت میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ مسلم لیگ کے پیروکاروں نے نعرہ لگایا کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ"... گاندھی نے اس پر طنز آمیز تبصرے میں کہا کہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مذہب تبدیل کرنے والوں کی کسی جماعت نے اپنی اصل قوم سے ہٹ کر علیحدہ قومیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہو"۔ اور "یہ پہلا موقع تھا کہ عوام کے ووٹوں کی قوت سے نہ صرف ایک ملک معرض وجود میں آیا بلکہ اسلام کی بنیاد پر معرض وجود میں آیا۔ اب ایک ایسے ملک کی تقدیر کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسلام ہی وہ چٹان ہے جس پر یہ ملک کھڑا ہے"۔

> **ہم اپنی عادت بد کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ اپنے پسندیدہ مشاہیر سے کوئی بشری کمزوری تک منسوب کئے جانے پر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں**

اور عجیب اتفاق ہے کہ اسی روز جنگ میں سلہری صاحب کے کالم کے عین نیچے مراسلات کے زمرہ میں مسی ساگا (کینیڈا) میں مقیم ایک پاکستانی مسلمان بیگ حسن اختر مرزا نے "قائد اعظم کیسا پاکستان چاہتے تھے" کا جواب دیتے ہوئے ایک نیا گل کھلایا اور اس پر مستزاد اگلے ہی روز پنجاب کے لاٹ صاحب، جناب الطاف حسین نے روزنامہ پاکستان کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی اسی نوع کی گوہر افشانی فرمائی ہے۔ وہ مراسلہ اس قابل ہے کہ پورے کا پورا یہاں پیش کیا جائے گا:

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب مولانا عبدالستار نیازی ہمیں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور میں اسلامیات پڑھایا کرتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے آغاز میں جب حضرت قائد اعظم مرحوم و

مغفور لاہور تشریف لائے۔ آپ ان سے ملاقات کرنے کے بعد کلاس میں تشریف لائے اور فرمایا "لڑکو! میں آج قائد اعظم سے مل کر آیا ہوں اور بہت مایوس ہوا ہوں اس لئے کہ میں نے ان سے پوچھا کہ "قائد اعظم آپ پاکستان میں کس قسم کی حکومت قائم کریں گے" تو انہوں نے بلا تامل فرمایا کہ "جس طرح کی حکومت اتاترک نے ترکی میں قائم کی تھی"۔

"چونکہ یہ تاریخ ساز بات ہے اس لئے یقیناً مولانا کو بھی یاد ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ میرے تب کے کافی ساتھی ابھی پاکستان میں زندہ سلامت ہوں گے۔ بہت ممکن ہے کہ کینیڈا میں سے کوئی بھی عینی اور تائیدی شاہد مل جائے وگرنہ "مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا' تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" اور میں بیان حلفی دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے صرف اور صرف اس دو ٹوک فیصلہ کی تائید یا تردید چاہئے۔ کسی کے جذبات' احساسات' نظرات یا نظریات سے مجھے کوئی غرض نہیں۔ گستاخی معاف' مولانا کیا ان دنوں مسلمانان ہند کے بیسویں صدی کے "سیاسی مجدد" اور ملت اسلامیہ کی کشتی کے "ناخدا" کے فرمودات کی صریحاً خلاف ورزی نہیں ہو رہی؟ کیا ان کے افکار کی سراسر نفی نہیں کی جا رہی؟ کیا وہ' جنہوں نے آج تک نظریہ پاکستان اور وجود پاکستان کو تسلیم نہیں کیا' مسند اقتدار پر براجمان ہونے کے لئے قوم کے ساتھ نہیں کھیل رہے؟ اگر خدانخواستہ وہ کامیاب ہو گئے (خاکم بدہن) تو کیا کچھ ایسا نہ ہو جائے گا کہ "منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے" خدا قائد اعظم کی لحد کو ٹھنڈا رکھے' آمین اور ان کی امانت کی حفاظت تا قیامت کرے ثم آمین!

عیار' آستین کے سانپ' چولے بدل بدل کر آ رہے ہیں' لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

مجھے اپنے استاد محترم سے ہاں یا نہ میں جواب کا انتظار رہے گا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں' صحیح فیصلہ قوم خود کرے گی کہ آج تک اس کو نہ تو کوئی بہکاوے میں لا سکا نہ اس نے کبھی دھوکہ کھایا ہے۔ نہ کوئی غلط فیصلہ کیا ہے اور نہ ہی کوئی غلط قدم اٹھایا ہے۔ وہ دوست اور دشمن کو اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہے"۔

جس ٹھسے سے مراسلہ نگار نے اپنے استاد محترم سے اپنے سوال کا جواب مانگا ہے' اس کے تیور بتاتے ہیں کہ مولانا نیازی خاموشی میں عافیت محسوس کریں گے۔ وہ کس منہ سے خاص طور پر آج کے حالات میں' اس بات کو دہرانے پر تیار ہوں گے کہ قائد اعظم پاکستان میں صرف سیکولر ہی نہیں بلکہ ایک اسلام دشمن حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے کیونکہ ترکوں کے بابا (اتاترک کے یہی معنی ہیں) مصطفیٰ کمال نے تو خلافت کا علامتی ادارہ ختم کر کے ایک طرف امت مسلمہ کے رہے سہے رعب داب اور عزت و وقار کو خاک میں ملایا تھا جس پر پوری صلیبی دنیا میں گھی کے چراغ جلائے گئے تو دوسری طرف اسلام کو ان عربوں کی میراث قرار دے کر جنہوں نے دشمنوں کے ورغلانے پر ترکان عثمانی کے خون ناحق کی ندیاں بہا دیں' خود اسلام ہی کو بالجبر ملک بدر کر دیا تھا۔

ہم قائد اعظم کو کوئی الزام نہیں دیتے بلکہ ان کی فروگزاشتوں پر اللہ سے مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور ان کے ایثار اور احسان کے بدلے میں مالک یوم الدین سے اجر عظیم کی توقع رکھتے ہیں

تاہم حقیقت یہ ہے کہ مصور پاکستان' علامہ اقبال نے جب یہ کہا کہ۔

اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خون صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

تو جس سحر کا خواب انہوں نے دیکھا' جانتے تھے کہ اسے صنم خانہ ہند سے ہی طلوع ہونا ہے۔ اپنے اس خواب کی تعبیر کو پاکستان کے نام سے منصہ ظہور میں لانے کی امید میں خود انہوں نے قائد اعظم کو انگلستان سے واپس آ کر مسلمانان ہند کے بکھرے ہوئے قافلے کو متحد کر کے آزادی کی منزل کی طرف گامزن کر دینے کی غرض سے قیادت کی دعوت دی تھی۔ یہ واقعات ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اور کوئی کوشش انہیں وہاں سے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو گی۔ لیکن اب آخر قائد اعظم سے منسوب اس طرح کے اقوال کی توجیہ کیا ہے؟۔ ہم اس سوال کا جواب پورے اعتماد سے دے سکتے ہیں' اس لئے کہ تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریک خلافت کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے پچھلے دو برسوں میں نوائے وقت اور جنگ میں اپنے کالموں کے ذریعے اور قبل ازیں روشن دلائل و براہین کے زور پر براہ راست ہمارے قلوب و اذہان کو اس طرح کے مسائل کے بارے میں ہر نوع کے مخمصوں سے بالکل پاک صاف کر دیا ہے۔ ہمیں اپنے اس موقف کے ان اجزاء پر انشراح صدر حاصل ہے کہ:

☆ قائد اعظم مسلمانان ہند کے عظیم محسن ہیں۔ انگریز اور ہندو کی دہری غلامی سے نجات دلا کر انہوں نے ہمارے حق میں وہی کام کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لئے کیا اور جو ان کی رسالت کے اولین فرائض میں شامل تھا۔

☆ ہم اپنی عادت بد کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ اپنے پسندیدہ مشاہیر سے کوئی بشری کمزوری تک منسوب کئے جانے پر مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور ان قابل احترام بزرگوں کے بارے میں بھی جو ہمیں پسند نہیں' کوئی اچھی بات سننے کے روادار نہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ معصومیت انبیاء و رسل پر ختم ہو چکی ہے اور ان سب پسندیدہ و ناپسندیدہ لوگوں سے غلطیوں اور خطاؤں کا صدور ہوا ہے۔

☆ قائد اعظم کی امانت و دیانت اور لیاقت و قابلیت کی قسم کھائی جا سکتی ہے تاہم آخری کامیابی حاصل کر لینے کے باوجود انہوں نے سیاسی غلطیاں بھی کیں جن کی تلافی کا انتظام اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے کرتا چلا گیا کیونکہ وہ ذات باری ہماری آہ و زاری پر مہربان ہو کر یہ فیصلہ فرما چکی تھی کہ انہیں مطلوبہ آزاد وطن دے کر آزمایا جائے کہ یہ اپنے عہد و پیمان پر قائم رہتے ہیں یا وہی نابنجاری کی روش اختیار کرتے ہیں جو قوم موسیٰ نے کر کے دکھائی اور نقد عقوبت میں تو چالیس برس کی صحرا نوردی ہی پائی تھی' انجام کار "مغضوب علیہم" قرار پائی۔ (اللہ تعالیٰ ہمیں اس نحوست سے محفوظ فرمائے۔ آمین)۔

☆ قائد اعظم عالم دین ہرگز نہ تھے اور علمائے دین کی عظیم اکثریت کا تعاون بھی انہیں حاصل نہ ہوا تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود اور مسلم لیگ کی پوری قیادت کی زندگیاں چند مستثنیات کے سوا' خواہر اسلام

سے خالی تھیں یعنی Practising Muslims نہ تھے۔ بایں ہمہ قائداعظم پوری بصیرت کے ساتھ اس امر پر یقین رکھتے تھے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد اسلام ہے اور ہم پاکستان اسلام ہی کے لئے حاصل کر رہے ہیں لیکن انہیں واضح طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ اسلامی حکومت کیا ہوتی ہے اور کیسے قائم کی جاتی ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے ان کے پاس وقت بھی نہ تھا (جنگ آزادی میں گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا اور انہیں اپنی مہلت زندگی کے مختصر ہونے کا شعور بھی حاصل تھا) اور رجال دین نے بھی انہیں سمجھانے کا حق ادا نہ کیا۔

☆ بنا بریں وہ اسلام کے ساتھ پورا خلوص و اخلاص رکھنے کے باوجود اور اپنے واضح اعلانات کے باوصف مختلف مواقع پر ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو اب ان کے اصل موقف کے خلاف استعمال ہوتی ہیں۔

گویا ہم قائداعظم کو کوئی الزام نہیں دیتے بلکہ ان کی فروگزاشتوں پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتے اور مسلمانوں کے لئے ان کے ایثار اور پاکستانیوں پر ان کے احسان کے بدلے مالک یوم الدین سے اجر عظیم کی توقع رکھتے ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں حرف آخر یہ ہے کہ ہم کلمہ گو قائداعظم کے نہیں' اللہ جل جلالہ اور محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ قائداعظم کا احسان مانتے ہیں لیکن حکم اللہ اور رسول کا مانیں گے جن کی طرف سے ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو عبادت رب میں نہ ڈھالنے پر دنیا و عقبیٰ دونوں میں خسران عظیم کی وعید سنائی گئی ہے۔ بیگ حسن اختر مرزا صاحب (جو یہاں یقیناً مرزا حسن اختر بیگ رہے ہوں گے) کان کھول کر سن لیں کہ پاکستان میں رہنے والے (اور وطن چھوڑ کر دور دیس جا کر بسنے اور اغیار کی خدمت گزاری کا "شرف" حاصل نہ کرنے والے) مسلمان اس اتاترک کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے جس نے مسلمانوں کی وحدت ملی کے علامتی ادارے' خلافت کی بقول اقبال' قبا چاک کر کے امت مسلمہ کے اعداء کا مشن پورا کیا بلکہ احیائے خلافت کے لئے کام کریں گے جو "یورپ کا مرد بیمار" نہیں ہو گی بلکہ منہاج نبوت پر ہو گی' اس دور خلافت راشدہ کی روایات کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرے گی جو تاریخ انسانی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو نظام خلافت کی شمع ہمارے اس خداداد ملک پاکستان میں ہی روشن ہو گی اور ان شاء اللہ پوری دنیا پر اللہ کے دین کے حتمی غلبے کی تمہید بنے گی جس کی بشارت اللہ کے سچے رسولؐ نے دی ہے۔

پنجاب کے گورنر صاحب سے بھی ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ اپنے کام سے کام رکھیں اور اتاترک کو آواز نہ دیں وہ قائداعظم کو بھی اتاترک ثانی سمجھنا چھوڑ دیں ورنہ اس ملک کا جواز ہی ختم ہو کر رہ جائے گا جس کے سب سے بڑے صوبے کے سب سے شاندار محل میں بیٹھ کر وہ دانشوری بھگارتے ہیں۔ خدارا قائداعظم کی روح کو مزید ایذا نہ دیجئے' آپ لوگ انہیں کیا اس صدی کا سب سے جھوٹا (خاکم بدہن) سیاستدان قرار دلوانا چاہتے ہیں؟۔

ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ احیائے اسلام کے اس عمل کو اصل تقویت پہنچانے کی سعادت "خراسان" کا مقدر بنے گی جو ایران کے مشرقی حصے' افغانستان' پاکستان کے بڑے علاقے اور وسطی ایشیا کی نو آزاد مسلمان ریاستوں پر مشتمل ہے۔ اس خطے کو اہل ایران آج بھی "خراسان بزرگ" کہتے ہیں۔ تحریک خلافت پاکستان نے اس آگہی کو عام کرنے کا کام شروع کیا ہے جس میں ہر مسلمان کا تعاون درکار ہے۔ پھر جن سعید روحوں میں خلافت کے اس ربانی نظام کی ضرورت کا احساس طلب سے بڑھ کر ایک تڑپ کا روپ دھار لے گا وہ ہماری اس انقلابی جدوجہد کا ساتھ دینے کے لئے بھی آگے بڑھیں گے جس کے لئے ایک قافلہ بنانے کے کام کا بیڑا بھی اٹھایا جا چکا ہے۔OO

(ماخوذ از "ندائے خلافت" ۱۵/ اگست ۹۴ء)

بقیہ : توجہ طلب

کے لئے آنے والوں کا اژدھام ہوتا ہے۔ اس میں جہاں نوجوانوں کی اکثریت ہوتی ہے وہاں بچے' بوڑھے اور خواتین بھی ہوتی ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نیکروں میں گھومتے پھرتے ہیں' اور یہ صرف ساحل سمندر ہی کا معاملہ نہیں بلکہ اب تو ایسے حضرات صدر کی مارکیٹوں میں بھی نظر آنے لگے ہیں۔ غالباً ترکستان سے آنے والے خواتین و حضرات جو فیشن اپنے ہمراہ لائے ہیں یہ اس کا اثر ہے۔ غالباً ان حضرات کو یہ معلوم نہیں کہ گھٹنا بھی ستر میں شامل ہے' جس طرح اکثر خواتین کو یہ نہیں معلوم کہ سر کے بال بھی خواتین کے ستر میں شامل ہیں جبھی وہ کسی ہیر کلر کی چلتی پھرتی اشتہار بنی پھرتی ہیں۔ البتہ ایک بات ضرور حیرت انگیز ہے کہ ہم خواتین کے ستر کی بے پردگی پر تو بڑے زود حس واقع ہوئے ہیں لہٰذا فوراً فتوے جاری ہو جاتے ہیں لیکن خود پر ہماری نظر نہیں ہوتی۔ حالانکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورۂ نساء میں صاف فرما رہا ہے کہ " للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن" یعنی "مردوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا اور عورتوں کے لئے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں"۔ لیکن یار لوگوں نے یہاں بھی ایک مغالطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ ترجمہ میں لفظ "کمانے" کی بنیاد پر۔ یعنی انہوں نے یہ فتویٰ صادر فرما دیا کہ عورتیں جو کچھ کاروبار یا ملازمت میں کمائیں' اس میں سے ان کے لئے حصہ ہے۔ حالانکہ لفظ "کسب" وہ کمائی نہیں ہے جو ہم روزی کی صورت میں کماتے ہیں۔ اس کے لئے قرآن میں ہر جگہ لفظ "فضل" استعمال ہوا ہے "کسب" تو نیکی یا بدی کی کمائی ہے۔ اصل میں یہ حضرات کسی نہ کسی بہانے خواتین کو گھر کی چار دیواری سے باہر لا کر اسے خاتون خانہ کی بجائے شمع محفل بنانا چاہتے ہیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی فتویٰ صادر کر دیا کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عورتوں کو چہرے کے پردے کے لئے مجبور کرے۔ ایسے لوگ اگر برا نہ مانیں تو ایک عرض کروں۔ ایک زمانہ میں جب کراچی میں نائٹ کلبس آباد تھے تو ایک شو ہوا کرتا تھا جسے Strip tease کہتے تھے' جس میں ناچنے والیاں بتدریج اپنے آپ کو کپڑوں سے آزاد کرتی تھیں۔ شاید یہ حضرات بھی اور ان کے تائید کرنے والے "Radical" اسلامی دانشور بھی یہی چاہتے ہوں اور اس کا آغاز چہرے کے پردے کی قید سے خواتین کو آزاد کر کے کرنا چاہتے ہوں۔

بہرحال مرد حضرات جس طرح آج نیکر میں نظر آ رہے ہیں اگر اس پر قدغن نہ لگائی گئی تو شاید کل کلاں کو Under wears میں محدود ہو کر رہ جائیں۔ مادر پدر آزادی اسی طرح تو آئے گی!! سوال یہ ہے کہ ہمارے وطن میں یہ جو کچھ ہو رہا ہے ایسا کیوں نہ ہو؟ وطن ہم نے بنایا اسلام کے نام پر جبکہ اقتدار پر قابض ہوئے سیکولر لوگ۔ علماء نے اپنے آپ کو مدرسوں اور دارالعلوموں میں قید کر لیا۔ جبکہ دارالعلوموں کی فضا سے باہر چند مذہبی سیاسی جماعتیں یہ کہتی ہوئی سیاست

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ایک پاکستانی کی ہجرت ثانی کی کہانی' ان کی اپنی زبانی

جو کوئے یار سے نکلے تو.....

(تیسری اور آخری قسط)

کھٹمنڈو---نیپال کے ایک حسین شہر کی سیر

محمد سمیع

"ندائے خلافت" کی باقاعدہ اشاعت کے تعطل کے باعث یہ سلسلہ مضمون بھی خاصے لمبے عرصے کے لئے تعطل کا شکار رہا۔ اس مضمون کی ماقبل قسط "ندائے خلافت" کے شمارہ ۲۱ مارچ ۹۳ء میں شائع ہوئی تھی۔

کلکتہ بذریعہ نارتھ بہار ایکسپریس صبح کو روانہ ہوئے تو دوسرے دن سمتی پور پہنچے اور وہاں سے لوکل ٹرین پکڑ کر رکسول پہنچے۔ چونکہ ہندوستان اور نیپال کے درمیان کوئی پاسپورٹ ویزا کی پابندی نہیں ہے لہٰذا مجھے میر گنج پہنچنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ شام ہو چکی تھی۔ پہلا کام یہ کیا کہ پانچ سو ہندوستانی روپوں میں سے خرچ کے بعد جو بقیہ ماندہ رقم رہ گئی تھی اس کو نیپالی روپے میں تبدیل کیا جو تقریباً سات سو روپے بنے۔ ہوٹل کا کوئی مسئلہ نہ تھا کیونکہ نیپالی عالمی سیاحوں کے لئے بڑی کشش رکھتا ہے لہٰذا یہاں ہر جگہ ہوٹلز اور لاجز وغیرہ بنے ہوئے ہیں اور سچ پوچھئے تو نیپال کی آمدنی کا خاصہ بڑا حصہ سیاحت کے شعبے سے حاصل ہوتا ہے۔ رات ایک لاج میں گزاری اور صبح بس کے ذریعہ کھٹمنڈو روانہ ہوا۔

نیپال چونکہ بیشتر پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے لہٰذا یہاں آمد و رفت کا ذریعہ یہی بسیں ہیں۔ راستے بھر خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ہر طرف سبزہ اور قدرتی چشموں کی بہار۔ وہ جو علامہ اقبال نے اپنی ایک نظم میں لکھا ہے کہ۔

پھول ہیں جنگل میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

اس کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے تھی۔ میر گنج اور کھٹمنڈو کے درمیان ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جس کی سطح سمندر کی بلندی تقریباً اتنی ہی ہے جتنی بلندی پر PIA کے فوکر طیارے پرواز کرتے ہیں۔ جب ہم اس مقام پر پہنچے ہیں تو بادل کے ٹکڑے تیرتے ہوئے بس کے اندر گزرے۔ ایک خوشگوار ٹھنڈک کا احساس ہوا' گو کہ یہ اکتوبر کی غالباً دوسری تاریخ تھی۔ ڈرائیوروں کی مہارت کی داد دینی پڑتی ہے۔ چڑھائی پر بس چلانا اتنا خطرناک نہیں ہوتا جتنا اسے بلندی سے نیچے لانا خطرناک ہوتا ہے۔ پھر کئی جگہ ایسے خطرناک موڑ کہ سامنے سے آنے والی گاڑی نظر نہ آئے۔ لیکن ایک تو ڈرائیور کی ساری توجہ سڑک پر ہوتی ہے پھر پتہ یہ چلا کہ حکومت کی طرف سے کوئی ایسا تیکنیکی انتظام ہے کہ گاڑی ایک مخصوص رفتار سے زیادہ تیز نہیں چلائی جا سکتی یعنی گاڑیوں میں Speed Governors نصب ہوتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے سارے راستے ہارن صرف ضرورت کے تحت بجائے جاتے ہیں۔ اب کا تو پتہ نہیں البتہ اس زمانے یعنی ۱۹۷۲ء میں بسوں میں نہ کوئی ریکارڈنگ کا بے ہنگم شور ہوتا تھا اور نہ اس میں ویڈیو فلموں کے چلانے کا اہتمام تھا۔ راستہ کے دونوں جانب کاشت کاری کا اہتمام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے قبل میں نے مرحوم مشرقی پاکستان میں چاٹگام سے اس کے پہاڑی علاقے رانگاماٹی اور پھر کرقلی کا بھی سفر کیا تھا لیکن جو لطف اس سفر میں آیا اس سے پہلے کہیں نہیں آیا تھا۔

کھٹمنڈو نیپال کا ایک حسین شہر ہے۔ یہ چھوٹا سا شہر چاروں طرف حسین اور سرسبز پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ شہر کے تقریباً وسط میں وہاں ایک حسین پارک ہے جو رتنا پارک کہلاتا ہے۔ شاہی مہمانوں کو استقبالیہ اسی پارک میں دیا جاتا ہے۔ بہرحال ہم جیسے فقراء کے لئے وہاں چھوٹے چھوٹے ہوٹل موجود ہیں۔ انہیں میں سے ایک ہوٹل میں' میں ٹھہر گیا لیکن ایک ہی دن کا کھانے کا بل سامنے آیا تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ راستے میں ہمارے ایک دوست مل گئے جو پی آئی اے میں ملازم ہیں اور اس وقت میری طرح غریب الدیار تھے۔ کہنے لگے کہاں ٹھہرے ہو۔ میں نے ہوٹل کا نام بتایا۔ کہنے لگے باغ خراب ہو گیا ہے۔ فوراً اپنا سامان لو اور میرے ساتھ چلو۔ میں جب سامان لے کر وہاں پہنچا جہاں یہ ٹھہرے ہوئے تے تو پتہ چلا دو تین خاندان اکٹھے رہ رہے ہیں۔ میں تو تھا ہی اکیلا' ان کے ساتھ شامل ہو گیا اور اخراجات میں برابر کا شریک ہو گیا۔ بازار سے سبزیاں آ جاتی تھیں۔ انہیں پر ہمارا گزارا ہوتا تھا۔ کیونکہ گوشت یہاں عموماً "جھٹکے" کا ملتا تھا یا خنزیر کا۔

"آپ کے بھائی جاتے ہیں تو چارپائیاں ٹوٹی ہوئی ملتی ہیں اور کمبل غائب پائے جاتے ہیں!"

مجھے ٹھیک سے تو یاد نہیں لیکن جہاں تک یاد پڑتا ہے پانچ روپے کھانا' ناشتہ اور کرایہ سب ہو جاتا تھا۔ اس طرح میں وہاں تقریباً ۲۵ دن رہا اور انہیں سات سو روپوں میں گزارا کیا۔

پہلا کام یہ کیا کہ پاکستانی سفارت خانہ جانے کے لئے ایک ٹیکسی پکڑی اور جب میٹر کی تیز رفتاری دیکھی تو آئندہ کے لئے کان پر ہاتھ رکھا۔ چالیس پیسوں کا یونٹ تھا اور ہندسوں میں اضافہ چالیس کے حساب سے ہی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پہاڑی علاقوں میں گاڑی کے Maintenance پر اخراجات بہت آتے ہیں۔ بہرحال سفارت خانے جا کر پتہ چلا کہ

پاکستانی سفیر جناب عنایت اللہ صاحب امریکہ گئے ہوئے ہیں۔ فرسٹ سکریٹری غالباً بشیر صاحب تھے' وہ بھی موجود نہیں تھے۔ سیکنڈ سکریٹری جناب خالد شفیع صاحب سے ملاقات کی۔ انہوں نے ایک طویل انٹرویو لیا۔ کہاں سے آئے ہیں۔ پاکستان کیوں جانا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے سفر کے اخراجات کون برداشت کرے گا۔ یہ چند اہم سوال تھے میں نے بتایا کہ میں الحمدللہ پاکستانی ہوں لہٰذا پاکستان جانا چاہتا ہوں' جو میرا وطن ہے۔ کہنے لگے لیکن آپ تو ایسٹ پاکستان کے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسٹ پاکستان بھی تو پاکستان ہی تھا۔ بہرحال میں نے انہیں کافی شفیق پایا۔ انہوں نے میری کمپنی کو ٹیلیکس کیا جس کا میں چانگام میں برانچ مینجر تھا۔ کہنے لگے کل آجائیے' جو جواب آئے گا وہ ہم آپ کو بتادیں گے۔ دوسرے دن گیا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ یہی معاملہ ہمارے ان دوست کا بھی تھا جن کے ساتھ میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ وہ کئی دنوں سے چکر کاٹ رہے تھے۔ آخر ان کے ذہن میں ایک تجویز آئی۔ کہنے لگے رائل نیپال ایرلائنز چلتے ہیں۔ ان کے ہاں سے تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم وہاں پہنچے تو کاؤنٹر پر ایک خاتون براجمان تھیں۔ انہوں نے اپنا تعارف بحیثیت پی آئی اے اسٹاف کے کروایا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں پاکستان ایک ٹیلیکس کرنا چاہتا ہوں' آپ کا تعاون چاہئے۔ کہنے لگیں آپ Matter لکھ کر دیں' میں ابھی ٹیلیکس کرواتی ہوں۔ انہوں نے ٹیلیکس کروانے کے بعد چٹ میرے حوالے کی کہ کل اس وقت آجائیے۔ میری جگہ جو بھی یہاں موجود ہو اسے یہ چٹ دکھائیے گا آپ کو ٹیلیکس کا جواب مل جائے گا۔ جواب ہمیں دوسرے ہی دن مل گیا۔ ہم نے دیکھا کہ نیپال کے شہری پاکستانیوں کے لئے اپنے دل میں بہت نرم گوشہ رکھتے ہوتے ہیں۔ ہمیں افسوس یہ تھا کہ کسی ملک کا شہری غیر ملک میں اپنے ملک کا سفیر ہوتا ہے اور اس کے رویئے غیر ممالک والوں کو اس قوم کے مزاج کا پتہ دیتے ہیں جس کا یہ فرد ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نیپال والے پاکستانیوں کی بہت عزت کیا کرتے تھے اور ہر قسم کا تعاون کرنے کو تیار رہتے تھے۔

"الحمدللہ میں پاکستانی ہوں' پاکستان جانا چاہتا ہوں جو میرا وطن ہے --- لیکن آپ تو مشرقی پاکستان کے ہیں --- مشرقی پاکستان بھی تو پاکستان ہے"

ٹیلیکس کا جواب مل گیا۔ کمپنی والوں نے ٹکٹ روانہ کر دیا تھا لیکن "ڈپلومیٹک بیگ" اسلام آباد سے موصول نہیں ہو رہا تھا اور نیپال میں پاکستانی سفارت خانے میں پاسپورٹ فارم دستیاب نہیں تھے۔ لوگ خاصے پریشان تھے۔ پریشانی کے عالم میں وہ بار بار سفارت خانے کا چکر لگاتے لیکن میں نے محسوس کیا کہ محکمہ داخلہ کے جو صاحب وہاں متعین تھے ان کا رویہ لوگوں کے ساتھ بڑا درشت تھا۔ میں ان کا نام تو نہیں لیتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی قسم کے لوگوں کے رویوں سے ہمارے سفارت خانے بدنام ہو رہے ہیں۔ ایک موقع پر جب لوگ کچھ زیادہ اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے چپڑاسی کو حکم دیا کہ ان سب لوگوں کو سفارت خانے سے دھکا دے کر باہر نکال دو۔ یہ بڑی عجیب بات ہے۔ عام لوگوں کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ غریب الوطنی میں اگر کوئی ہم وطن اسے مل جائے تو اسے بے پناہ خوشی ملتی ہے۔ غالباً ایسے ہی موقعوں کے لئے شاعر نے کہا تھا کہ

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا خوب غریب الوطنی ہوتی ہے

لیکن "افسر ہر جا افسراست"

وقت گزارنے کے لئے ہم اکثر آؤٹنگ پر نکل جاتے۔ کبھی کھٹمنڈو شہر کے وسط میں واقع لکڑی کے بنے ہوئے کئی منزلہ مندر کی سیر کرتے۔ کبھی بادشاہ کے پرانے محل میں گھومتے پھرتے' جو اب ایک آثار قدیمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کبھی پہاڑی پر واقع گولڈن ٹمپل دیکھنے چلے جاتے۔ کبھی رتنا پارک میں چہل قدمی کر رہے ہوتے۔ یہیں ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہاں کے حالات پر گفتگو ہوئی۔ سنا تھا کہ نیپالی اپنے بادشاہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ لیکن جب میں نے نیپال میں غربت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ یہاں تعلیم کے حصول پر قدغنیں ہیں۔ میٹرک کے بعد دو سال کا وقفہ کرنا پڑتا ہے پھر انٹر میں داخلہ ملتا ہے۔ اسی طرح بی۔اے اور ایم۔اے کے لئے بھی۔ لہٰذا لوگ تعلیم کم ہی حاصل کر پاتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ نیپالی عوام کو جان بوجھ کر تعلیم کے میدان میں آگے نہیں بڑھنے دیا جا رہا ہے کہ کہیں ان میں اتنا شعور نہ بیدار ہو جائے کہ وہ بادشاہت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ میں نے کہا شراب یہاں پانی کی طرح پی جاتی ہے' لیکن مجھے سڑکوں پر کوئی غل غپاڑہ کرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ حالانکہ گھروں میں یہ پی کر خوب اودھم مچاتے ہیں۔ کہنے لگا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کے قوانین بہت سخت ہیں۔ چھوٹے موٹے جرم پر ڈانٹ ڈپٹ یا جرمانہ وغیرہ کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ناگزیر حالات میں کسی کو جیل میں ڈالا جاتا ہے۔ بادشاہ کا دربار عام سال میں ایک بار "دسہرے" کے موقع پر لگتا ہے۔ اسی موقع پر مقدمات فیصل ہوتے ہیں۔ اگر دربار عام کے دوسرے دن کوئی پکڑا جائے تو وہ اگلے دربار عام تک جیل میں سڑتا رہتا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ اس کی ضمانت کرالیں تو وہ یہ کہیں گے کہ ٹھیک ہے ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں' آپ اس کی جگہ آجائیے۔ پھر جیلوں میں کھانا قیدی کو اپنے گھر سے منگوانا پڑتا ہے۔ مزید یہ کہ قیدی تو جیل میں رہنے تک اس کا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ سزائیں بہت سخت دی جاتی ہیں۔ واللہ اعلم' اس نوجوان کی باتوں

"نیپالی حکومت نے جان بوجھ کر تعلیم پر قدغنیں عائد کر رکھی ہیں"

تھے۔ ہوٹلوں میں ایک ایک کمرے میں انہوں نے دو دو تین تین اضافی چارپائیاں ڈلوائی ہیں لیکن کوئی اضافی کرایہ نہیں لیا۔ انہیں پتہ تھا کہ یہ سارے لٹے پٹے لوگ ہیں۔ لیکن ان کا شکوہ یہ تھا کہ جناب ہمارا تو حال یہ ہے لیکن آپ کے بھائی جب جاتے ہیں تو چارپائیاں ٹوٹی ہوئی ملتی ہیں اور کمبل وغیرہ غائب پائے جاتے ہیں۔ ہم انہیں سمجھاتے کہ بھائی سارے پاکستانی ایسے نہیں ہوتے۔ بہرحال اچھے برے ہر معاشرے میں میں کتنی صداقت تھی البتہ میں نے یہ ضرور دیکھا کہ ملاوٹ وہاں نہیں کی جاتی۔ کسی جیب کترے کو نہیں دیکھا۔ اس معاشرے میں چونکہ مرد وزن کا ایک دوسرے سے ملنا معیوب نہیں لہٰذا جنسی جرائم بھی ناگزیر ہوں گے لیکن VULGARITY نام کی شے نظر نہیں آتی۔

ہم نے وہاں کے ایک مقامی وکیل سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ بڑا پر لطف آدمی تھا۔ جب میں کبھی

بوریت کا اظہار کرتا تو کہتا کہ میاں NEW ROAD کے چکر لگا لو۔ EYE VITAMINS مل جائیں گے' بوریت دور ہو جائے گی۔ کبھی کبھی وہ اپنے ساتھی کو میرے ساتھ کر دیتا کہ ان کو ذرا شہر کی سیر کرا لاؤ۔ اس کے ساتھ میں نیپال کی پنچائت ہال (PARLIAMENT) بھی گیا۔ اس نے بتایا کہ یہاں شاہ بیٹھتے ہیں' یہاں اسپیکر اور یہ ارکان پارلیمنٹ کی نشستیں ہیں۔ پھر گورنمنٹ دفاتر کی سیر کی۔ محکمہ خارجہ کا دفتر دیکھا اور دوسرے دفاتر دیکھے۔ کہیں کوئی پابندی نہیں۔ بس انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ۔ مہمان ہندوستان سے آیا ہے۔ ہم تو یہاں صوبائی سکریٹریٹ میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اسمبلی ہال تو دور کی بات ہے۔ میں نے وہاں (MINT) سکوں کے ڈھالنے کا کارخانہ عام شاہراہ پر دیکھا۔ یہاں کاروبار پر عموماً ہندوستانی سکے چھائے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں کچھ مسلمان بھی ہیں۔ کھٹمنڈو شہر میں مسلمانوں کی (اگر مجھے صحیح یاد ہے تو) تین مساجد ہیں۔ اب زیادہ ہوں گی۔ چین کی مصنوعات یہاں کے بازاروں میں بھری پڑی ہیں کیونکہ چین کا بارڈر یہاں سے زیادہ دور نہیں۔

اکتوبر کی پچیس تاریخ تک میرے پیسے ختم ہونے کو آئے تو میں بھاگا ہوا سیکنڈ سکریٹری' خالد شفیع صاحب کے پاس پہنچا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ڈپلومیٹک بیگ آج ہی اسلام آباد سے پہنچا ہے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ چونکہ میرے پیسے ختم ہونے والے ہیں لہٰذا آپ میری مدد کریں۔ کہنے لگے کہ کیا آپ سرکاری ملازم ہیں۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے پھر تو میں کچھ نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر آپ سرکاری ملازم ہوتے تو میں آپ کے لئے الاؤنس مقرر کروا دیتا۔ میں نے کہا کہ مجھے الاؤنس نہیں چاہئے۔ البتہ آپ ذرا..... صاحب سے سفارش کر دیں کہ وہ میرا پاسپورٹ جاری کر دیں تو میں کراچی روانہ ہو جاؤں۔ کہنے لگے بھائی یہ بڑا مشکل کام ہے۔ ہمارا محکمہ خارجہ ہے اور وہ محکمہ داخلہ کے آدمی ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ میری بات نہیں سنیں گے۔ میں نے کہا ذرا کوشش کر دیکھئے' آخر آپ سفارت خانہ کے سیکنڈ سکریٹری ہیں۔ بے چارے راضی ہو گئے۔ کہنے لگے میرے ساتھ آئیے۔ ان صاحب کے پاس جا کر کہا کہ اس بے چارے کے پیسے ختم ہونے کو ہیں لہٰذا برائے کرم ان کا پاسپورٹ جاری کر دیں۔ فوراً جواب دیا۔ نہیں نہیں' یہ کیسے ہو سکتا ہے' جب ان کی باری آئے

پاکستان میں اسلام کا نفاذ کیوں ضروری ہے؟

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" سے اقتباسات)

"پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصر حاضر کی دوسری لامذہبی (Secular) اور تجدد پسند (Modernist) حکومتوں کی تقلید تاریخ جدید کا ایک عظیم سانحہ ہو گا اور ان کروڑوں افراد کے ساتھ بیوفائی جنہوں نے اس اسلامی معمل اور تجربہ گاہ کے قیام کے لئے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی' اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہو گا کہ یہ طرز عمل ہمیشہ کے لئے اس امنگ اور آرزو کو سرد کر دے گا اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو اگر ختم نہیں تو نہایت بعید بنا دے گا اور بے لاگ تاریخ اور انسانی تجربہ اس کی اجازت بھی نہیں دے گا کہ پھر اس کا نام لیا جائے' پاکستان کی اس نازک اخلاقی ذمہ داری کو پروفیسر اسمتھ (Wilfred Cantwell Smith) نے بڑے اچھے انداز سے بیان کیا ہے وہ اپنی کتاب (Islam In Modern History) میں لکھتے ہیں :-

"شاید پاکستانی کسی وقت یہ خیال کریں کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کا کام ان کے ابتدائی اندازہ سے کہیں زیادہ دشوار طلب ہے لیکن سوچا جائے تو اب ان کے لئے کوئی راہ مفر نہیں' ان کے وعدے اور دعوے اتنے بلند بانگ اور واضح تھے کہ ان کی تکمیل سے گریز ناممکن ہو گیا ہے ان کی تاریخ اب "تاریخ اسلام" ہو گئی' ان کے کندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے' اب خواہ وہ اسے پسند کریں یا اس پر نادم ہوں' بہرحال وہ "اسلامی ریاست" کے تصور کو نظرانداز نہیں کر سکتے اور نہ اسے زیادہ دیر سرد خانہ ہی کی نذر کر سکتے ہیں' کیونکہ اس وقت اسلامی ریاست کے نظریہ کو ختم کرنے کا فیصلہ محض طریق کار کی تبدیلی کا فیصلہ ہی نہیں ہو گا' یہ تو گویا اپنے دین اور وطن کی اساس پر کلہاڑا چلانے کے مرادف ہو گا اور تمام دنیا اس گریز سے یہی مطلب اخذ کرے گی کہ اسلامی ریاست کا نظریہ یعنی اور اس کا نظریہ محض فریب نظر تھا جو حیات جدید کے تقاضوں سے نپٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا یا یہ کہ پاکستانی بحیثیت ایک قوم کے اسے اپنی قومی زندگی پر نافذ کرنے میں ناکام رہے ہیں' اس صورت میں دنیا کے نزدیک خود مسلمانوں کے معتقدات ایمانی ہی مشکوک اور قابل تقلید ٹھہریں گے"۔

مولانا ندوی اس کتاب میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"یہ تاریخ کا عجیب المیہ اور سیاست کی عجیب "ستم ظریفی" ہے کہ کسی ملک میں جب تک آزادی کا معرکہ درپیش رہتا ہے اور غیر ملکی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ان عوام کی قربانیوں' سرفروشی اور جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے جو خدا کی رضا' اخروی اجر و ثواب اور اسلام کی سربلندی کے سوا کسی مقصد سے دلچسپی نہیں رکھتے' مذہب کی زبان کے سوا کسی زبان سے آشنا نہیں ہوتے اور مذہبی نعروں کے بغیر ان کے خون میں گرمی اور ان کے دماغوں میں نشہ پیدا نہیں کیا جا سکتا تو جنگ آزادی کے رہنما اس زبان کے سوا اپنے عوام سے کسی اور زبان میں گفتگو نہیں کرتے' وہ مذہبی نعروں ہی کے ذریعہ اور اللہ کے نام کی بلندی' اسلام کی سربلندی اور اللہ کے احکام کے اجراء کا لالچ دے کر ان کو آگ سے کھیلنے اور خاک و خون میں لوٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسی ایمانی طاقت سے (جس کے مقابلہ میں کم سے کم مسلمان اقوام میں کوئی طاقت نہیں پائی جاتی) آزادی کا قطع فتح کرتے ہیں اور ناقابل تسخیر دشمن کو سرنگوں ہونے پر مجبور کرتے ہیں' لیکن جیسے ہی یہ ناگزیر منزل طے ہوتی ہے اور ملک کا اقتدار اعلیٰ اور ان سیاسی رہنماؤں کی زبان میں "ملک و قوم کی قسمت" ان کے ہاتھ میں آ جاتی ہے وہ ملک کو مغربیت اور لامذہبیت (سیکولرازم) کے راستہ پر ڈالتے ہیں اور جلد سے جلد مذہب اور معاشرہ کی اصلاح' اسلامی قانون (پرسنل لاء) کی تنسیخ و ترمیم اور ملک کو مغرب کے سانچہ میں ڈھالنے کا "ضروری" کام شروع کر دیتے ہیں اور اس میں اتنی عجلت و شدت سے کام لیتے ہیں کہ بعض اوقات وہ لوگ جنہوں نے بے دریغ قربانیاں دی تھیں یہ سوچنے لگتے ہیں کہ انہوں نے شاید غلطی کی اور ملک کی آزادی اسلامی زندگی اور مذہبی آزادی کے لئے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوئی' ۱۹۲۴ء کے ترکی سے لے کر ۱۹۶۲ء کے الجزائر تک یہ ایک مسلسل داستان ہے جس میں کوئی استثناء نظر نہیں آتا اور عرب ممالک میں بھی پورے عزم و ارادہ اور جوش و خروش کے ساتھ اسی ترکی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جس کے اقتدار کے خلاف انہوں نے کبھی بغاوت کی تھی اور جس کی سیاست سے وہ اب بھی بیزار نظر آتے ہیں"۔

یورپی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی لاٹری!!

یہ ہے وہ یورپ کی تعلیم جس نے تیسری دنیا کو مرعوب کر رکھا ہے!

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

یورپی یونیورسٹیاں بھی پیسے بٹورنے کا ایک ذریعہ ہیں

عبدل (یہ ان کا اصل نام نہیں) یورپ کی ایک ممتاز یونیورسٹی میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کر رہا ہے۔ یہ روشن دماغ' باصلاحیت اور محنتی نوجوان --- نباتات کے شعبہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے حکومت کے خرچ پر یہاں آیا ہے۔ اس کی حکومت ہر سال چوٹی کے پانچ فیصد گریجوایٹس کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اعلیٰ تربیت حاصل کرنے اس لئے بیرون ملک بھیجتی ہے تاکہ یہ ذہین نوجوان واپس آکر ملک و قوم کی ترقی کے لئے کام کر سکیں لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ وہ یہاں محض اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یونیورسٹی میں جو کچھ وہ سیکھ رہے ہیں اس سے زیادہ جاننے والے لوگ تو پہلے ہی ان کے ملک میں موجود ہیں۔ چنانچہ جب وہ اپنے مقالے پر دنیا کی چوٹی کی یونیورسٹی کا ٹھپہ لگوا کر واپس لوٹیں گے تو ان کی یہ ریسرچ سوائے نمائش کے ان کے غیر صنعت یافتہ ملک کے کسی کام نہیں آئے گی۔

ایک اور نوجوان احمد ہے' جو پوسٹ گریجوایٹ ریسرچ کے لئے یہاں مقیم ہے۔ عبدل کی طرح اعلیٰ تعلیمی صلاحیت سے بہرہ ور یہ نوجوان ایک مشہور امریکی ادارے میں نیچرل سائنسز کا طالب علم ہے۔ اگرچہ اب وہ اپنی پی ۔ ایچ ۔ ڈی مکمل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ وہ اسے بالکل چھوڑ چھاڑ کر واپس جا رہا تھا۔ میرے سپروائزر کا میرے ساتھ برتاؤ ایسا تھا گویا میرا تعلق کسی غلام نسل سے ہے۔ میرے پراجیکٹ کا میرے ملک کی ضروریات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ میں آنکھیں بند کر کے بلا چوں و چرا اپنے سپروائزر کے کہنے پر عمل کرتا ہوں۔ اگر کچھ کہنے کی جرات کروں گا تو پی ۔ ایچ ۔ ڈی خطرے میں پڑ جائے گی۔ پھر بولنے کا فائدہ کیا؟

مسلم اور دوسرے غیر ترقی یافتہ ممالک اپنے یہاں کے ذہین ترین طلباء کو یہ سوچ کر مغربی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم دلوانے پر ہر سال ۱۰۰ ملین ڈالر سے زائد رقوم خرچ کر رہے ہیں کہ اس کا بہترین نعم البدل انہیں جدید تعلیم کی شکل میں میسر آئے گا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان طلباء کو سوائے تعصب' لاعلمی' بے جا امتیاز اور پریشانی کے کچھ وہاں سے حاصل ہی نہیں ہوتا۔ عموماً ان طلباء سے معمول سے زیادہ اخراجات وصول کئے جاتے ہیں۔ مقامی طلباء کی نسبت انہیں کم تر تصور کیا جاتا ہے اور ان کی ملکی

> **یورپ میں ترقی پذیر ممالک کے طلباء کو سوائے تعصب' لاعلمی' بے جا امتیاز اور پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا**

ضروریات یا رجحانات سے قطع نظر اپنی مرضی کے موضوع ان پر ٹھونس دیا جاتا ہے۔ ایک سفارت کار نے "امپیکٹ" کو بتایا کہ اصل میں تو یہ سارا کاروبار ہے۔ ان یونیورسٹیوں نے ہمیں روپیہ کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ ہمارے طلباء چونکہ اس ماحول میں اجنبی ہوتے ہوئے ہیں' اس لئے یہ لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے طلباء میں خود اعتمادی کی کمی کا بھی مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ زبان کی مشکل پیش آتی ہے' چونکہ ان طلباء پر ایک ہی دن سوار ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ "جادوئی" پی ایچ ڈی ہاتھ آجائے' اس لئے وہ ان مشکلات کو برداشت کر جاتے ہیں۔

ایک اور ملک کے سائنسی شعبہ سے متعلق سرکاری افسر نے بتایا ہے کہ ہماری ملکی ضروریات کے ساتھ پی ۔ ایچ ۔ ڈی پراجیکٹس کی عدم مناسبت کے پیش نظر ہم اپنی اس پالیسی پر نظر ثانی کرنے کا سوچ رہے ہیں' جو ہم نے اپنے طلباء کو بیرونی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلانے کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں تو یہ پورا معاملہ ہی خاصا مشکوک نظر آتا ہے۔ جتنی بڑی رقم ہم اس پر خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی فائدہ حاصل ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص محض شوق کی وجہ سے ایک بڑی دکان سے سودا خرید رہا ہو' حالانکہ وہی شے محلے کی دکان پر آدھی قیمت میں دستیاب ہو۔ باہر سے آنے والے طلباء کی خراب حالت کی ایک لیکچرار نے تائید کرتے ہوئے بتایا کہ کئی طلباء تعلیم ادھوری چھوڑ کر لوٹ جاتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ قسمت کا کھیل ہے۔ کسی طالب علم کو اچھا نگران اور اچھی درس گاہ میسر آگئی تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے ورنہ اکثر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔

یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے منتظمین اس طرح کی باتوں پر کوئی دھیان نہیں دیتے' اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ باہر سے آنے والے طلباء کی کوئی کمی نہیں اور ان کا دھندا چلتا رہے گا۔ حالانکہ حکومت کی طرف سے یونیورسٹی بجٹ میں کٹوتی کے باعث ان کی آمدنی کا زیادہ انحصار اب انہی بیرونی طلباء پر رہ گیا ہے۔ چنانچہ لندن یونیورسٹی نے پیش بینی کے طور پر اپنا ایک کیمپس کوالالمپور میں بھی قائم کر لیا ہے۔ اگرچہ فوری طور پر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تاہم بیرونی ممالک سے طلباء کی آمد میں کمی ان یونیورسٹیوں کے لئے ویرانی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں جب یونیورسٹی حکام سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے طلباء کی شکایات کا اعتراف تو کیا لیکن ساتھ ہی اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا کہ یہ یونیورسٹیاں اپنی شہرت کا ناجائز فائدہ اٹھاتی ہیں۔

ایک استاد کا کہنا تھا کہ عام طور پر مشکلات اس وجہ سے پیش آتی ہیں کہ بیرونی ممالک کے طلباء نے تحقیق کے لئے درکار بنیادی تربیت حاصل نہیں کی ہوتی اور اپنے طور پر مطالعہ کرنے میں انہیں دقت پیش آتی ہے۔ ایک دوسرے صاحب نے اس کا زیادہ ذمہ دار ان حکومتوں اور یونیورسٹیوں کو ٹھہرایا جو ان طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یہاں بھیجتی ہیں اور جہاں اتنی سائنسی ترقی نہیں ہوئی کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کر کے واپس آنے والوں کو مناسب جگہ دے سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے بعد اکثر طلباء یہیں رہ جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

علی جس نے حال ہی میں برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کیا ہے' اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیمی عہدہ پر فائز ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کا واپس اپنے ملک جانے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں' اس لئے کہ وہاں سرے سے کسی علمی اور تحقیقی کام کی کوئی اہمیت اور وقعت ہی نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ بات نہیں ہے کہ وہاں پیسے کی کمی ہے۔ مجھے ایک ملین ڈالر سامان منگوانے کے لئے دیئے مگر اس سامان کو استعمال میں لانے کی اجازت نہیں۔ وہاں عجیب قسم کا ماحول ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ مسلم ممالک سائنس کے میدان میں دنیا میں سب سے پیچھے ہیں اور حال یہ ہے کہ گزشتہ تیس سال کی مسلسل ناکامیوں کے باوجود وہ یہ تک طے کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ جن طلباء کو وہ بیرون ملک پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے بھیج رہے ہیں' ان کی اصل ضرورت کس موضوع سے متعلق ہے۔ یہ بڑی بے حسی ہے کہ قیمتی زرمبادلہ محض اس خوشی میں لٹا دیا جائے کہ یورپ یا امریکہ کی کسی بڑی یونیورسٹی میں داخلہ تو ملا ہے۔ چاہے ملکی سطح پر اس کی کوئی افادیت ہو یا نہ ہو' جبکہ حساس قسم کی ٹیکنالوجیز پہلے ہی غیر ملکیوں کی رسائی سے باہر ہیں۔ غیر ترقی یافتہ ممالک کی حکومتوں کو سوچنا چاہئے کہ جب وہ پوری قیمت ادا کر رہی ہیں تو کم از کم وہ چیز تو لیں جس کی واقعی انہیں ضرورت ہے۔OO

(بشکریہ امپکٹ انٹرنیشنل' لندن' مارچ ۱۹۹۵ء)

تذکیر

دین سے ہمارا تعلق ہے کتنا؟

ہم اجتماعی اور انفرادی' ہر سطح پر دین سے روگردانی کے مرتکب ہو رہے ہیں

آج تفسیریں لکھنے کی نہیں' قرآن سے حقیقی تعلق پیدا کرنے کی ضرورت ہے

نجیب صدیقی

دین اسلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس دین کو اختیار کرنے والوں سے کچھ چیزیں ترک کرنے اور کچھ اختیار کرنے کو کہا جاتا ہے۔ یہ ترک و اختیار اس کی اپنی مرض پر نہیں ہے بلکہ اس دین کا تقاضا ہے۔ دین اسلام کیسے ہم مکمل ضابطہ حیات کہتے ہیں' اس کے اپنے کچھ اصول و قواعد ہیں۔ اس کا اپنا ایک نظریہ ہے۔ اس کی اپنی ایک ہیئت ہے۔ اس میں جہاں کہیں بھی آپ تبدیلی کریں گے' وہ اپنی اصل جگہ سے ہٹ جائے گا۔ وہ آپ کی خواہشات کا دین تو ہو سکتا ہے' دین اسلام نہیں ہو گا۔ پر شدید انحطاط سے دوچار ہے۔

دین اسلام کی پہلی اینٹ عقیدہ توحید ہے جسے ہم ایمان بھی کہتے ہیں۔ ایمان اس پختہ عقیدے کا نام ہے جس میں توحید' آخرت' کتاب اور وہ تمام چیزیں جو نبی کے توسط سے آتی ہیں ان کو ماننا۔ ان تمام باتوں کو خوش دلی سے اختیار کرنے کا نام ایمان ہے۔ ایمان کے قلب و ذہن میں راسخ ہو جانے سے عمل کا وہ داعیہ پیدا ہوتا ہے' جو مطلوب ہے۔ اگر عمل نہیں ہے تو گویا کہ وہ ایمان قلب و ذہن میں جاگزیں نہیں ہوا ہے بلکہ محض زبانی کلامی ہے۔ اس کی ایک شکل کو

"سماجی سطح پر ہم تمام غیر اسلامی رسومات پر عمل پیرا ہیں اور مطمئن بھی ہیں کہ دین پر عمل پیرا ہیں"

منافقت کہتے ہیں۔ امت اس ایمان حقیقی سے انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی محروم ہو چکی ہے' الا ماشاء اللہ۔ اس محرومی کا عکس پورے معاشرے پر ہے۔ اس انحطاط نے حیلے بہانوں کے پہاڑ تراش لئے ہیں۔ اسلام میں یہ پیوند کاری ایک عرصہ سے جاری ہے۔ مسلمان بھی ہیں اور وعدہ خلاف بھی ہیں۔ مسلمان بھی ہیں اور زانی بھی ہیں۔ مسلمان بھی ہیں اور سود خور بھی۔ مسلمان بھی ہیں اور ملاوٹ کا کاروبار بھی ہے۔ مسلمان بھی ہیں اور دھوکہ بھی کر رہے ہیں۔

اجتماعی سطح پر بھی یہی حال ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ لوگ جو اللہ کی کتاب کے احکامات کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم بھی ہیں' فاسق بھی ہیں اور کافر بھی۔ ہمارا عدالتی نظام وہی کافرانہ ہے جو انگریز کے دور میں تھا۔ ہم اس نظام میں جج بھی بنتے ہیں اور اس کے وکیل بھی' ان کافرانہ عدالتوں سے فیصلہ لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں۔ پھر بھی ہمیں ضد ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ معاشی میدان میں سود کو اختیار کر رکھا ہے اور بڑے اطمینان سے کاروبار بھی جاری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ انہیں پیسوں سے عمرہ اور حج بھی ہو رہا

ہے۔ پھر بھی سچے پکے مومن ہیں!

سیاسی سطح پر بندوں کی خدائی کا ڈنکہ بج رہا ہے۔ کسی معاملے میں دین اسلام سے نہیں پوچھا جاتا کہ اس کی رہنمائی کیا ہے۔ پھر بھی ہم اسلام کے علمبردار ہیں۔ سماجی سطح پر تمام غیر اسلامی رسموں کے ہم امین ہیں اور مطمئن ہیں کہ ہم دین پر عمل پیرا ہیں' ان تمام باتوں کی تہہ میں جو اصل بات ہے وہ یہ کہ ایمان حقیقی سے ہم سب عاری ہیں۔ ایمان محض قولی ہے جو ہمارے کردار پر اثر انداز نہیں ہو رہا۔ صرف ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور اس میں سے وہ روح نکل چکی ہے جو اسے متحرک کرتی ہے۔ بے شمار لوگ آپ کو ہمارے معاشرہ میں ملیں گے جو اس تجزیئے سے اتفاق کریں گے' پھر بھی وہ متحرک نہیں ہوتے۔ جب ہم غور کرتے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر صرف کتاب اتار دی جاتی تو اس کے ساتھ کوئی صاحب کتاب نہ ہوتا تو محض کتاب یا محض نظریہ معاشرے میں انقلاب برپا نہیں کر سکتا۔ کتاب سے زیادہ صاحب کتاب کی شخصیت متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کے ساتھ صاحب کتاب کی زندگی ہی اس کتاب کی تفسیر ہوتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یوں تو پوری امت کی ذمہ داری ہے مگر علماء نے اس کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے۔ ہمارے یہ علماء کرام اگرچہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں مگر وہ معاشرے کو متاثر نہیں کر سکتے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ ان کا تعلق زبانی کلامی ہے۔ انہوں نے اسے اپنے اندر جذب نہیں کیا ہے۔ اس صورت میں اس کے اثرات کا ظہور کیسے ممکن ہے؟

کتاب کی تفسیریں آج جتنی موجود ہیں' اس سے پہلے کبھی نہ تھیں' نہ ہی صحابہ کرام کے دور میں تھیں۔ آج یہ کتاب جتنی پڑھی جاتی ہے کسی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی اشاعت کے ادارے آج جتنے ہیں اس سے قبل نہ تھے۔ قال اللہ و قال الرسول کہنے والوں کا ایک انبوہ ہے مگر اس سے معاشرے میں کوئی تغیر نہیں۔ اس کا واحد سبب بھی یہی ہے کہ ایمان محض قولی رہ گیا ہے۔ معاشرے کو درست کرنے اور اسے کتاب کے اصولوں پر استوار کرنے کے لئے جب تک صاحب کتاب پیدا نہیں ہونگے' معاشرہ درست نہیں ہو گا۔ ان صاحبان کتاب کی ایک معتدبہ تعداد کا وجود ضروری ہے۔ یہ جب تک ان اوصاف سے متصف نہیں ہوں گے جو دور اول میں تھے' اس وقت تک دلوں میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ خرابی کی جڑ قول و فعل کا تضاد ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یہ تبدیلی چاہتے ہیں' لیکن ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دوسروں میں تبدیلی چاہتے ہیں خود اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کے روادار نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تک داعی کے اندر وہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی اور وہ اپنے کو کتاب کے سانچے میں ڈھال نہیں لیتا وہ معاشرے میں کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکتا۔ کتاب کے مطابق ڈھالنے کے عمل کے لئے ہمارے پاس وہ ماڈل ضروری ہے۔ اس کی اتباع کے بغیر کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔

ہم جنہیں "نقش قدم" کہتے ہیں اس کو اپنائے بغیر معاشرے کو استوار نہیں کر سکتے۔ وہ لوگ جو اس

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

مادی ترقی کے ثمرات !!

(نیوز ویک' ۳/ اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والے چند خطوط کے اقتباسات)

وومن فانگ' ہانگ کانگ

ہانگ کانگ میں زندگی گزارنا عذاب سے کم تر نہیں ہے۔ قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے خوشحال زندگی گزارنے کی تمنائیں پوری بھی ہوئیں تو اس طرح کہ زندگی سے آرام اور سکون ہی رخصت ہو گیا۔ ہانگ کانگ میں کوئی بھی چین میں نہیں ہے۔ گھر گرہستی کی زندگی گزارنے والی عورتیں اور بچے تک اس طوفانی زندگی کا شکار ہیں۔ چنانچہ لوگ ایسی ریاضتیں کرنے لگے ہیں جن سے تکان میں کچھ کمی واقع ہو۔

سٹیفنی گرے لیولسی' ون ٹکا۔ الی نائے

رات گئے گھر واپسی' چھٹی کا دن دفتری مسائل میں غارت' بچوں کے سکول کے معاملات سے لاتعلقی' اخراجات میں کمی کرنے کے مسائل' ہفتہ وار چھٹیاں اگلے ہفتے کی تیاری میں گزر جانا' یہ ہیں میرے اور میرے خاوند کے شب و روز۔ یہی رونا ہمارے ملنے والے روتے ہیں۔ ہم پر تو جو گزرتی ہے سو گزرتی ہے' سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کیا یہی وہ قابل رشک زندگی ہے کہ جس کی لوگ تمنا کیا کرتے تھے۔

ڈائنی ٹیلر' سانٹا کلارٹا' کیلیفورنیا

میرا انیس گھنٹے کا دن ہر روز صبح ۳/ بجے شروع ہوتا ہے۔ دو گھنٹے سفر میں' آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی' پانچ سے کم عمر کے دو بچوں کی دیکھ بھال' خاوند کے لئے دوپہر کا کھانا تیار کر کے بھجوانا' روز مرہ کی اشیاء کی خریداری' خانہ داری' گھر کی صفائی' دھلائی وغیرہ اور جب سونے کی باری آتی ہے تو تھک کر چور ہو چکے ہوتے ہیں۔

جان ڈے' پریسکاٹ' اریزونا

میں محکمہ جنگلات میں آگ بجھانے کی ڈیوٹی پر مامور ہوں۔ میرا وہ دن نہایت خوشگوار ہوتا ہے جس دن مجھے دفتر سے باہر نکل کر جنگل میں باڑ کی مرمت اور جھاڑ جھنکار کی صفائی وغیرہ کا کام کرنا ہوتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ چمک دمک کی زندگی کی خواہش کرنے والوں کو اس کے نتائج کے بارے میں ضرور معلوم کر لینا چاہئے۔OO

"زبان یار من ترکی" مرحوم کی شخصی خوبیوں کی آئینہ دار ہے

مرحوم کی سب سے بڑی خوبی ان کا یقین محکم ہے

حافظ افروغ حسن

اقتدار احمد مرحوم بصیرت کی گہرائی اور بصارت کی تیزی سے سرفراز تھے

"زبان یار من ترکی" معروف صحافی اور ہفت روزہ "ندائے خلافت" لاہور کے مدیر جناب اقتدار احمد مرحوم کی آخری تصنیف ہے۔ ۳/جون ۹۵ء کو انہوں نے یہ کتاب اپنے ایک عزیز کے ہاتھ میرے پاس مطالعے اور تبصرے کے لئے بھیجی تھی۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی طرف سے میرے لئے آخری تحفہ ثابت ہوگا۔ ۶/جون کو صبح ۳ بجے عین اس وقت جب وہ اپنے محبوب حقیقی سے راز و نیاز کی سرگوشیوں میں منہمک ہوا کرتے تھے' فرشتہ اجل وہ آخری پیغام لے کر آگیا جو ہر ذی روح کا لازمی مقدر ہے' چنانچہ وہ اپنے عزیزوں اور پیاروں کو بلکتا اور تڑپتا چھوڑ کر اس سفر پر روانہ ہو گئے جس پر جانے والا کبھی واپس نہیں آیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ہم سب اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔

عزیزم اقتدار احمد کو مرحوم لکھتے ہوئے جہاں قلم کا جگر شق ہوا جاتا ہے وہیں رنج و الم کی شدت سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اس کرب و محن کی کیفیت میں صرف رب رحیم و کریم کی ذات ہی واحد سہارا ہے جس سے صبر و ثبات کی بھیک مانگی اور دعا کی جاسکتی ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں اور نوازشوں کے مسکن میں پناہ دے۔ آمین!

اقتدار احمد مرحوم اپنے ادبی اور صحافتی کمالات کے ساتھ ساتھ صنعتی اور کاروباری میدان میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں اور بے کراں قابلیتوں سے نوازا تھا۔ انہوں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی ان تھک جدوجہد اور مسلسل محنت و مشقت سے تعمیراتی شعبے میں قابل رشک خدمات انجام دیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر کتاب صاحب کتاب کے طرز فکر' ذہنی رجحانات' قلبی میلانات اور اس کی سیرت و کردار کی عکاس ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت جب ہم "زبان یار من" کا بغائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس کے آئینے میں مصنف مرحوم کی چند خوبیوں کے جو نقوش ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں ان سے ہم قارئین کو آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

مرحوم کی سب سے اہم خوبی ان کا یقین محکم ہے کہ ہر شخص کو اس فانی زندگی کے بعد رب جلیل کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن اور سخت زہرہ گداز ہوگا۔ اس موقع پر رب رحیم کی رحمت اور اس کا فضل و کرم شامل ہو گیا تو نجات کی راہ نکل آئے گی ورنہ بندے کی کیا مجال کہ وہ صرف اپنے اعمال کے بل بوتے پر کامیابی و کامرانی کا دعویٰ کر سکے۔ وہ کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

"میری زندگی کا آخری مرحلہ اس کڑے دن سے شروع ہونے والا ہے جب سورج سوا نیزے پر ہوگا اور مجھ سمیت ہر انسان پر ایک ہی فکر سوار ہوگی... نفسی نفسی... اس روز بھی اگر موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے' قطرے جو تھے میرے عرق انفعال کے تو بیڑا پار ہو جائے گا ورنہ... ورنہ پھر وہی جس کا یہ ناہنجار بندۂ خدا سزا وار ہے"۔ (صفحہ ۹)

مصنف مرحوم کی وہ دوسری خوبی جو انہیں فرض شناسی اور باعظمت انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے' وہ ان کی حق شناسی' اور محسن کی قدر افزائی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اعلیٰ اخلاقی صفت ان کی فطرت کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ ان کا احساس یہ تھا کہ ان کی رفیقہ حیات کی مخلصانہ اور وفاشعارانہ رفاقت نے ان کی زندگی کو نکھارا بھی اور سنوارا بھی اور ان کے لئے اعتدال اور بشاشت و شائستگی کی راہیں کشادہ کیں۔ اس گہرے احساس کے تحت مرحوم نے اپنی یہ آخری کتب انہی کے نام منسوب کی اور اس انتساب کے موقع پر ان کے اخلاص و ایثار کو جس دلسوزی کے ساتھ خراج تحسین پیش کیا ہے وہ نہایت اثر انگیز ہے۔ لکھتے ہیں:

"انتساب اپنی اہلیہ مریم کے نام' جس کی رفاقت میسر نہ آئی ہوتی تو زندگی کا یہ کمزور سا دھارا نہ جانے کس سمت بہتا... کبھی کا ریگ زار ہستی میں جذب ہو کر نابود ہو چکا ہوتا... اللہ تعالیٰ اسے باقی زندگی اور حیات ابدی میں وہ آرام عطا فرمائیں جو میں اسے فراہم نہ کر سکا"۔

اقتدار احمد مرحوم کی وہ تیسری خوبی جو ہماری نئی نسل کے لئے ایک مشعل ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے وہ ان کا اسلامی تہذیب و ثقافت سے والہانہ لگاؤ تھا۔

اسی وابستگی کی وجہ سے ان کا دل بڑوں کے ادب و احترام کے جذبات سے منور تھا۔ ان کے بڑے بھائی ترکی کے سفر میں ان کے ہمراہ تھے۔ اسی لئے ان کا ذکر

"یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد ملت اسلامیہ کیلئے ایک گراں قدر سرمایہ ہیں"

اس سفرنامے میں م تعدد بار آیا ہے لیکن کسی موقع پر بھی ان کا ذکر برادر محترم کے لاحقے کے بغیر نہیں کیا۔ طرز بیان سے صاف عیاں ہے کہ بڑے بھائی کی ذات کے لئے عقیدت و محبت اور ادب و احترام کے چشمے ان کے دل کی گہرائی سے ابلے پڑ رہے تھے۔ ان کے شریک سفر ان کے برادر محترم عالم اسلام کی ممتاز شخصیت یعنی ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت ملت اسلامیہ کا ایک گراں قدر سرمایہ ہے۔ قدرت نے انہیں فہم قرآن کا خصوصی ملکہ بخشا ہے اور یہ استعداد بھی ودیعت فرمائی ہے کہ وہ قرآن کریم کی دعوت حق اور انسانیت نواز پیغام کو پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے انتہائی مدلل' موثر اور فکر انگیز پیرائے میں

پیش کر سکیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دعوت و ارشاد کے کام کو جس چیز نے تسخیر اور تاثیر کی طاقت عطا کی ہے وہ ان کا اخلاص و ایثار ہے۔ انہوں نے دنیاوی فوائد کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر اپنی پوری زندگی اس تہذیب کے رنگ میں رنگ لی ہے جس کے وہ داعی اور علمبردار ہیں۔ یہ رنگ ان کی اولاد' ان کے اہل خانہ اور افراد خاندان پر بھی غالب ہے۔ اکثر لوگ اس یک رنگی اور ہم آہنگی کو ڈاکٹر صاحب کی ہمہ گیر اور ہمہ پہلو تربیت کا کرشمہ قرار دیتے ہیں' مگر ہمارے نزدیک ان پر یہ پروردگار حقیقی کا خصوصی انعام و اکرام ہے ورنہ ہماری تاریخ تو ایسے بے شمار مصلحین کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جن کے فیض تربیت سے ایک مخلوق خدا مستفید ہوئی مگر اپنے بڑی حد تک محروم رہے۔

فاضل مصنف کو اپنے برادر محترم کا مشن جان و دل سے عزیز تھا۔ اس راہ میں انہوں نے اپنا مال بھی کھپایا' ذہنی توانائیاں بھی صرف کیں اور اپنے قیمتی اوقات کا سرمایہ بھی لگایا۔ اس ایثار و قربانی کا اجر وہ مولائے حقیقی سے جنت النعیم کی صورت میں لازمی طور پر حاصل کریں گے۔ انشاء اللہ۔

مصنف مرحوم کا یہ آخری قلمی شاہکار ان کی جس چوتھی خوبی کو واشگاف کرتا ہے' وہ ان کی بصیرت کی گہرائی' بصارت کی تیزی' مردم شناسی کی غیر معمولی استعداد اور مشاہدات سے ٹھیک ٹھیک نتائج کے استنباط و استخراج کی صفت تھی۔ ان فطری خوبیوں نے ان کی عملی جد و جہد میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کھول دیں۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ایک انجینئر تھے۔ اگرچہ انہوں نے کسی انجینئرنگ یونیورسٹی سے سند حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنے عملی تجربے کی بنا پر فن تعمیر کی باریکیوں اور نزاکتوں پر بھی ماہرانہ دسترس حاصل کر لی تھی کہ بڑے بڑے ماہر اور تجربہ کار انجینئر بھی ان کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے تھے۔ انگریزی میں ڈرافٹنگ کی مہارت قابل رشک تھی۔ انہیں اپنے فن اور پیشے کے تقاضوں کے پیش نظر درجنوں غیر ملکی سفر بھی کرنے پڑے۔ انہوں نے چین بھی دیکھا اور جاپان بھی۔ امریکہ اور یورپ کا بڑا حصہ کھنگالا۔ مشرق اوسط کے مختلف ممالک کی سیاحت کی۔ سعودی عرب تو کئی بار جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ انہوں نے اپنے ہر سفر کی روداد قلمبند کی جو ہفتہ وار "ندا" لاہور میں شائع ہوتی رہی۔ ان سفروں میں حاصل ہونے والے تجربات و مشاہدات نے ان کی شخصیت میں توازن اور پختگی اور نظر و فکر میں گیرائی و گہرائی پیدا کی۔

"مصنف کا اسلوب تحریر ایک لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ وہ ضرب الامثال اور کہاوتیں ایسی چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت کے حسن و جمال میں اضافے کا موجب بن جاتی ہیں"

زیر تبصرہ کتاب "زبان یار من ترکی" مصنف کے ترکی کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے۔ یہ سفر انہوں نے اپنے برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے ہمراہ جولائی ۱۹۹۲ء کے آخر میں کیا تھا۔ سفر کی تقریب اس طرح ہوئی کہ "اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ" جس کا صدر دفتر امریکی شہر شکاگو میں ہے' اس کے منتظمین نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے دوسرے کنونشن میں بطور مہمان خصوصی شمولیت کی دعوت دی تھی۔ کنونشن کا افتتاحی اجلاس ترکی کے مشہور شہر استنبول کے ۲۲ منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل "مرمرہ" میں ۲۹ جولائی کو منعقد ہوا۔ پھر اجلاسوں اور خصوصی نشستوں کا سلسلہ پانچ روز جاری رہا۔ اس طرح امریکہ سے آنے والے متعدد مسلم ڈاکٹروں اور اسکالروں سے تعارف کے مواقع میسر آئے۔ اس تقریب کی وجہ سے فاضل مصنف کا ترکی میں قیام تقریباً ایک ہفتے رہا۔

اس عرصے میں انہوں نے استنبول اور اس کے گرد و نواح کو غور سے دیکھا' تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا' قدیم عمارات کا فنی جائزہ لیا اور وہاں کے تہذیبی اور ثقافتی مناظر کو اپنی فکر و نظر کے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ اسی دوران میزبان رسول حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ آبنائے باسفورس کی پر لطف سیر کی اور ساتھ ہی سلطنت عثمانیہ کے سب سے پہلے دارالحکومت "برصہ" میں ایشیائی ترکوں کی مذہبیت کے روح پرور مناظر دیکھے۔

فاضل مصنف نے اپنے اس سفر کے تاثرات و مشاہدات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کنونشن کے دوران ڈاکٹر اسرار احمد کی حکیمانہ دعوتی اور تبلیغی سرگرمیوں کی تفصیل بڑے پر اثر انداز میں بیان کی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے ترک قوم اور عثمانی سلطنت کے اولوالعزم سلاطین و خلفا کے وہ محیر العقول اور تاریخ ساز کارنامے بھی بیان کر دیے ہیں جن کی بدولت یہ سلطنت صدیوں تک ملت اسلامیہ کے تحفظ کا فریضہ انجام دیتی رہی۔ یہ اپنے دور عروج میں دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے طاقتور سلطنت تھی۔ اس کا پھریرا دنیا کے تین براعظموں یعنی یورپ' افریقہ' اور ایشیا کے چالیس لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبے پر لہراتا تھا۔ اس کی فوج جدید ترین اسلحے سے لیس تھی۔ اس کا بحری بیڑا دنیا کا مضبوط ترین بیڑا تھا۔ اس کی فرمانروائی پورے بحیرہ روم پر قائم تھی۔

عثمانی سلاطین کی عدل گستری اور رعایا پروری کے دوست اور دشمن سبھی معترف تھے۔ فاضل مصنف ترک قوم اور ان کے سلاطین کے تعمیری کردار کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"سلاطین و خلفائے عثمانی اور ترک مسلمان خود بھی بڑے جفاکش اور سادہ لوگ تھے۔ عیش و نشاط کی وہ عادات جو اکثر مسلمان حکمران خاندانوں کو لے بیٹھیں وہ ان میں نہ ہونے کے برابر تھیں' چنانچہ شراب نوشی جیسی علت سے بھی ایک دو حکمرانوں کے سوا سب محفوظ رہے۔ قانون پسندی شروع ہی سے ان کے مزاج میں داخل تھی اور یہ بھی نہیں کہ قانون صرف رعایا کے لئے ہو اور حکمران قانون سے بالاتر ہوں"۔ (صفحہ ۱۱)

عثمانی خلفاء نے اپنے دار الخلافے قسطنطنیہ یعنی استنبول کو جس جوش و خروش اور جس انہماک سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا عظیم الشان اور فقید المثال

"اقتدار احمد مرحوم اپنے ادبی اور صحافتی کمالات کے ساتھ ساتھ صنعتی اور کاروباری میدان میں بھی ایک نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ قدرت نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں اور بے کراں قابلیتوں سے نوازا تھا"

مرکز بنایا' اس کی ایک جھلک سفر نامے میں ملاحظہ فرمائیے :

"استنبول میناروں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔ جدھر دیکھئے خوبصورت' سڈول بلند و بالا مینار نظر آتے ہیں۔ اکثر مساجد کی چوکسی کرتے ہیں۔ یہی حال گنبدوں کا ہے' ایک جیسے' شاندار یکسانیت اور بوقلمونی کا حسین امتزاج۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس پرانے قسطنطنیہ میں بعض گرجاؤں کے سروں پر بھی گنبدوں کے تاج ہیں۔ کسی نووارد کو یہ پہچان پیدا کرنے میں بڑا وقت لگتا ہے کہ اس کی نظریں مسجد کے گنبدوں کا طواف کر رہی ہیں یا پرانے کلیسا کے کسی کلس سے الجھ کر رہ گئی ہیں۔ ویسے مساجد کا یہاں کیا شمار' مسلم دنیا کا کون سا بڑے سے بڑا شہر ہے جو مسجدوں کی تعداد' ان کی وسعت اور سربلندی میں استنبول کے مقابلے کی سوچ بھی سکے"۔ (صفحہ ۲۸)

> "ہماری تاریخ تو ایسے بے شمار مصلحین کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جن کے فیض تربیت سے ایک مخلوق خدا مستفید ہوئی مگر اپنے بڑی حد تک محروم رہے"

"بر کمالے را زوالے" کے آفاقی اصول کے تحت مسلمانوں کی یہ عظیم الشان سلطنت غیروں کی سازشوں اور اپنوں کی ناچاقیوں اور ریشہ دوانیوں کی نذر ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ترک جیسی بہادر قوم پر "یورپ کا مرد بیمار" جیسی ذلت آمیز پھبتی کسی جانے لگی۔ آخرکار بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں اتاترک کی قیادت میں ایک پر زور تحریک برپا ہوئی جس نے مسلمان ترک قوم کو اسلامیت و خلافت کی آغوش عاطفت سے نکال کر لادینیت و مغربیت کی گود میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے باوجود مغرب نے اس کے ساتھ جو معاندانہ اور سفاکانہ سلوک روا رکھا ہے اور یہودیوں نے اپنی حیلہ طرازیوں اور عیاریوں سے کام لے کر اس کی پوری معیشت پر اپنا کنٹرول قائم کر کے اسے افراط زر کے جس مہیب گڑھے میں دھکیل دیا ہے اس کی خوفناک جھلکیاں فاضل مصنف کی تحریر کے آئینے میں ملاحظہ فرمائیے وہ لکھتے ہیں :

"ترکی کے سکے "لیرا" کی ناقدری کا عالم اب ناگفتہ بہ ہو چکا ہے۔ افراط زر' مغرب' بالخصوص امریکہ کی امداد سمیت قرضوں پر انحصار اور درآمد شدہ اشیائے صرف کے بے محابا استعمال نے جمہوریہ ترکیہ کی معیشت کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے... ساٹھ کے عشرے میں ایک ڈالر سات ترکی لیرے کے برابر تھا۔ آج ایک ڈالر کے بدلے سات ہزار لیرے ملتے ہیں۔ گویا ۳۰ برسوں میں لیرے کی قدر ہزارواں حصہ رہ گئی ہے.... افراط زر کی شرح وہاں اسی نوے فیصد کے درمیان ہے۔ (صفحہ ۴۰-۳۹)

مغربیت کے عشق نے ترک جیسی بہادر اور غیور قوم کا اخلاق و کردار پستی اور ذلت کے جس مقام پر پہنچا دیا ہے' اس کی منظر کشی فاضل مصنف اس طرح کرتے ہیں :

"کہنے کو تو استنبول میں مشرق و مغرب گلے ملتے ہیں' لیکن یہاں مشرق مارے انکسار کے بچھ گیا ہے اور مغرب اس کی چھاتی پر سوار ہے۔ مغربیت مشرقیت کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔ یہاں دنیا کے اس واحد شہر پر جو دو براعظموں میں واقع ہے' یورپی تہذیب نے اس اضافی رنگ کی چھاپ بھی ہے جو بے حیائی کی آخری حدوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ نوجوانوں جوڑے ایک دوسرے کے ساتھ چپکے سڑکوں' فٹ پاتھوں اور پارکوں میں مٹرگشت اور خوش فعلیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ عریانی خطرے کس نشان سے بس ذرا نیچے ہے' یعنی سینہ شمشیر سے شمشیر کا دم ابھی پوری طرح باہر نہیں آیا"۔ (صفحہ ۲۶)

فاضل مصنف نے جہاں یورپی استنبول میں مغربیت اور لادینیت پر مبنی تہذیب کے روح سوز مناظر دیکھے ہیں' وہیں ایشیائی ترکی کے شہر "برصہ" کی مسجد کبیر میں نماز ظہر کا ایمان پرور منظر کا بھی مشاہدہ کیا ہے جس نے ان کے قلب و روح کو فرحت و انبساط کی فضا سے معمور کر دیا' چنانچہ اپنا یہ مشاہد وہ بیان کرتے ہیں :

"اس وقت اذان میں نصف گھنٹہ اور ظہر کی جماعت میں پون گھنٹہ باقی تھا' اس کے باوجود مسجد میں چہل پہل ایسی تھی جو ہمارے ہاں شہروں کی بڑی مساجد تک میں جمعے کی نماز میں بھی دیکھنے میں نہیں آتی۔ بیشتر لوگ باوضو آتے اور جگہ جگہ ستونوں کے ساتھ ریک نما الماریوں میں سے قرآن مجید کے نسخے اٹھا کر پڑھنے بیٹھ جاتے۔ مسجد میں نمازیوں کی آمد کی شرح اور رفتار نے ہمیں

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

آزاد پاکستان!!

پاکستان کی ایک اعلیٰ عدالت نے حال ہی میں سلامت مسیح اور رحمت مسیح کی رہائی کا جو حکم صادر کیا ہے وہ اس لئے نہیں تھا کہ ملزمان کے خلاف سرے سے کوئی شہادت موجود نہیں تھی بلکہ انہیں شک کا فائدہ دیا گیا جس کی بنا پر ان کی رہائی عمل میں آئی۔ اس کے برعکس انگریز کی عدالت میں (جن کی پیروی کو ہم اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں) چار دوسرے کشمیریوں سمیت میرے خلاف گیارہ سال قبل ایک بھارتی سفارت کار کو قتل کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ سننے والے جج کا کہنا تھا کہ میرے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں وہ ناکافی ہیں مگر اس کے باوجود درپردہ میرے لئے پندرہ سال قید کی سزا مقرر کر دی۔ ۱۹۶۸ء میں سیکرٹری داخلہ نے اپنے طور پر اسے مزید دس سال آگے بڑھا دیا اور اس وقت تک اسے صیغہ راز میں رکھا جب تک ۱۹۹۳ء میں ہم نے یہ طویل قانونی جنگ جیت نہیں لی۔ جب ان کی یہ کارستانی ہمیں معلوم ہوئی تو ہم نے ان کے خلاف ہائی کورٹ میں دعویٰ دائر کر دیا جس نے ان کے فیصلے کو ۱۶/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو کالعدم قرار دے دیا' مگر اس کے باوجود ہم ابھی جیل میں ہیں۔ حالانکہ ہمارے ایک ساتھی تو دس سال کی بجائے گیارہ سال کی قید بھگت چکے ہیں۔ پاکستان میں عیسائیوں کے حق میں عدالتی فیصلے پر فی الفور عمل درآمد ہو جاتا ہے مگر یہاں برطانیہ میں سیکرٹری داخلہ کسی مسلمان کے معاملے میں ہائیکورٹ کے فیصلے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

قیوم راجہ' ایچ۔ ایم پرزن لانگ لارٹن ایوشم' انگلینڈ

(امپیکٹ انٹرنیشنل' لندن' اپریل ۱۹۹۵ء)

محترم جناب سردار اعوان صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ'

آپ کا خط موصول ہوا تو مجھے اقتدار احمد صاحب کی رحلت کا علم ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ میں اپنے آپ سے نہایت شرمندہ ہوں کہ غروب عظمت کی خبر ہی نہ ہو سکی۔ شاید آپ اسے تراشا ہوا عذر گردانیں لیکن گزشتہ تین چار ماہ سے وزارت خزانہ کے معاون مشیر برائے مالیاتی امور نے میری خدمات میرے محکمہ (شماریات ڈویژن) سے مستعار لے رکھی ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ میزانئے (بجٹ) کی تیار کس قدر پیچیدہ اور وقت طلب کام ہوتا ہے۔ چنانچہ جون کے آخر تک بجٹ کی تیاری اور بعد ازاں اسمبلی میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات کی تیاری وغیرہ کے سلسلہ میں اس قدر مصروفیت رہی کہ رات گئے تک بلکہ چھٹیوں میں بھی دفتر جانا پڑا۔ گویا یوں سمجھ لیں کہ ایک طرح سے دنیا سے کٹ کر رہ گیا۔ اسی دوران اقتدار احمد صاحب ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ آپ کے خط کے ذریعہ اس اندوہناک حادثے کی اطلاع ملی تو یہ باور کرنا ہی ناممکن تھا کہ وہ شخص جو اندھیروں میں روشنی کا انتظام کرنے میں منہمک تھا اب تہہ خاک گہری نیند سو رہا ہے۔

اب میں سوچتا ہوں کہ اقبالؒ نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ عصر حاضر ہمارے لئے ملک الموت بن کر آیا ہے جس نے فکر معاش دے کر ہماری روح ہم سے چھین لی ہے۔ ہم روزہ مرہ کے کاموں میں اتنا الجھ جاتے ہیں۔ زندگی کے قضیوں سے اتنا تھک جاتے ہیں کہ اپنے اردگرد دیکھ ہی نہیں پاتے کہ شمعیں کس قدر تیزی کے ساتھ پگھلتی جا رہی ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں اقتدار صاحب جیسے صاحب علم و فکر کی جدائی اہل خاندان ہی نہیں ہمارے جیسے کوتاہ قامت لوگوں کے لئے بھی باعث رنج و ملال ہے' خاص طور پر اس لئے کہ ایک ایک کر کے پرانے بادہ کش اٹھتے جا رہے ہیں۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ حریف مئے فراغگن عشق ڈھونڈے نہیں ملتے' ایسے میں دل خون کے آنسو نہ روئے تو اور کیا کرے۔ دراصل موت ہی انسانی زندگی کا وہ اہم مرحلہ ہوتا ہے جب ہمیں اپنی بے بسی عاجزی اور لاچارگی کا صحیح معنوں میں احساس ہوتا ہے۔ ہمارا بس چلے تو ہم اپنی زندگی کی کچھ ساعتیں عظیم لوگوں کے لئے قربان کر دیں یعنی خطہ زیست کی مقدار ہر فرد کے لئے جدا جدا ہے۔ ہم چاہیں بھی تو اپنے محسنوں' اپنے چاہنے والوں کو اپنے سے جدا ہونے سے نہیں روک سکتے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے' مرحوم کی تقصیریں معاف فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)۔

آپ کی دعاؤں کا طالب

حبیب اللہ شاہد' اسلام آباد

بخدمت گرامی قدر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سلمہ

السلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ'

مزاج گرامی بخیریت مطلوب' میں نے اپنے گہرے نیک دوست جناب اقتدار احمد صاحب کی وفات کی ناگہانی خبر سنتے ہی اپنے دکھ و غم اور آپ سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن نہ ہی "ندائے خلافت" میں اس کا تذکرہ ہوا اور نہ ہی کوئی اطلاع آپ کی طرف سے موصول ہوئی۔

محترم بھائی اقتدار احمد صاحب سے میرے تین سال کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے۔ ۱۸/اپریل ۹۴ء کو "ندائے خلافت" کے دفتر میں موصوف سے ایک خوشگوار ملاقات ہوئی تھی۔ کوئی تین بجے ہم وہاں پہنچے تھے اور موصوف تکلیف کر کے اپنے گھر سے بطور خاص مجھے ملنے کے لئے آئے۔ مغرب تک میرے ساتھ رہے۔ آپ اس دن ملتان تشریف لے گئے تھے۔ میں جب بھی کوئی مضمون بھیجتا تھا تو فوری طور پر "ندائے خلافت" میں شائع کرتے تھے۔ ملاقات کے دوران بھی زور دیکر "ندائے خلافت" کے لئے لکھنے کو کہا۔ موصوف جس پیار' محبت اور خلوص سے پیش آئے وہ ابھی تک فراموش نہیں ہوا۔ اس ملاقات میں کئی کتابیں تحفتاً عنایت فرمائیں اور اس سے پہلے بھی بھیجتے رہے تھے۔ سیرت پر میری ضخیم اور معرکہ الآرا کتاب "پیارے پیغمبر ﷺ غیروں کی نظر میں" کے لئے آپ سے تقریظ لے کر بھیجنے کا وعدہ کیا تھا' لیکن بوجوہ وہ پورا نہیں کر سکے۔ میں بھی اپنی کتابیں موصوف کو ارسال کرتا رہتا تھا۔ میرے پاس موصوف کے کم از کم تین چار خطوط محفوظ ہوں گے۔ چند ماہ پہلے میں نے اپنی تازہ کتاب "نظریہ ارتقاء اور اسلام" تحفتاً بھیجی تھی اور تبصرہ کے لئے عرض کیا تھا۔ لیکن شاید اس وقت بیمار تھے اور تبصرہ نہ کر سکے۔ "ندائے خلافت" میں زبان یار من ترکی کا اشتہار پڑھا۔ آپ سے التماس ہے کہ براہ کرم ایک کاپی رعایتی قیمت پر ارسال فرمائیں تاکہ اپنے عظیم دوست کی پہلی اور آخری کتاب تو پڑھ سکوں اور محفوظ رکھوں۔

یہ بالکل سچ لکھ رہا ہوں کہ جب "ندائے خلافت" میں موصوف کی وفات کی خبر پڑھی تو اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے دل پر بجلی سی گری ہے اور بیساختہ زبان پر کئی مرتبہ اناللہ وانا الیہ راجعون نکلتا رہا۔ بہت دکھ اور غم ہوا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل اور مرحوم کو اجر جزیل عطا فرمائے۔

محتاج دعا

(مولانا) محمد رمضان عفی عنہ

استاد

مدرسہ عربیہ مظہر العلوم حمادیہ' خیرپور' سندھ

اسرار صاحب۔ السلام علیکم

عزیزی اقتدار احمد کے ناگہانی سانحہ ارتحال سے سے سخت صدمہ و افسوس ہے' بھائی دست بازو ہوتا ہے اور اقتدار احمد تو ہر لحاظ سے قوت بازو تھے۔ خدا انہیں جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔

ان کی یادداشتیں اور سفرنامے جو مختلف اوقات میں شائع ہوتی رہی ہیں' ادبیت' شگفتگی اور تازگی لئے ہوئے ہیں' جنہیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک واقعی ادیب چھپا ہوا تھا' اگر ان کی یادداشتیں اور سفرنامے ایک مجموعہ کی شکل میں شائع ہو جائیں تو ان کی اچھی یادگار ہوگی۔

والسلام

ڈاکٹر سید اسلم' کراچی۔

بخدمت واجب الاحترام جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

مزاج بخیر' موقر ہفت روزہ "الاعتصام" میں یہ اندوہناک خبر پڑھنے کو ملی کہ آپ کے برادر عزیز مرحوم اقتدار احمد کا انتقال ہو گیا ہے اناللہ وانا علیہ راجعون۔ آپ کو ایک قابل اعتماد بھائی اور ساتھی کے بچھڑ جانے سے جو صدمہ ہوا ہوگا اس میں ہم آپ کے شریک ہیں' دعا ہے کہ رب کعبہ آپ کو صبر جمیل کرنے کی توفیق بخشے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے آمین۔ بلاشبہ وہ آپ کا بہت بڑا سہارا تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مرحوم کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا' بحرحال صبر کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعف عنہ

والسلام

آپ کا عقیدت مند

مولا بخش محمدی

لیکچرار ڈگری کالج مٹھی۔ ضلع تھرپارکر' سندھ

بقیہ : پاکستان سے پاکستان تک

گی جبھی پاسپورٹ بنے گا۔ سیکنڈ سکریٹری صاحب مایوس ہو کر اپنے دفتر میں واپس آ گئے۔ مجھ سے کہنے لگے دیکھا' میں نہ کہتا تھا کہ وہ میری بات نہیں مانیں گے۔ میں حیران تھا کہ سیکنڈ سکریٹری کا اختیار اپر ڈویژن کلرک پر نہیں چلتا۔ بہرحال ان سے معذرت کی۔ دوسرے دن جب سفارت خانہ پہنچا تو میرے پاسپورٹ کے اجراء کی باری آ چکی تھی۔ شام کو برما ایئرلائن سے رنگون کے لئے روانہ ہوا' جہاں سے ایئر فرانس کی Conecting Flight پکڑنی تھی۔ رنگون ایئرپورٹ پر کافی انتظار کے بعد جب ایئرفرانس کی فلائٹ پہنچی تو پتہ چلا کہ یہ تو پہلے ہی سے Over-Loaded ہے۔ غالبًا راستے میں انہیں چین کے ایک وفد کو طیارے میں سوار کرنا پڑا تھا۔ اب ایئر فرانس کا عملہ ہم مسافروں کے میں سے ہر ایک کی خوشامدیں کر رہا تھا کہ آپ یہاں رک جائیں' ہم آپ کو رنگوں شہر کی سیر کروائیں گے' پھر یہاں سے بنکاک لے جائیں گے' پھر کراچی پہنچا دیں گے۔ کچھ لوگ رک گئے۔ میرے پاس بھی آئے۔ دل تو بہت چاہا کہ ایک رات رک کر ذرا بہادر شاہ ظفر مرحوم کا مزار ہی دیکھ لوں لیکن جب منزل سامنے ہو تو پھر آدمی کہیں دم لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ میں نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ مجھے تو آج ہی کراچی پہنچنا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ایئر فرانس کے طیارے میں بیٹھا۔ تصور میں اپنے گمشدہ' اپنے پیارے پاکستان میں گم تھا۔OO

بقیہ : کتاب نامہ

متحیر کر دیا۔ یہ منگل کا دن تھا' یعنی ہفتے کا ایک عام دن جس میں بالخصوص ظہر اور عصر کی نمازیں خاص مصروفیت کے اوقات میں آتی ہیں' لیکن یہاں عالم ہی دوسرا تھا۔ ہمارے ہاں سے بھی مختلف اور استنبول کی مساجد کے تو بالکل برعکس"۔ (صفحہ ۱۵۴)

الغرض پوری کتاب دلچسپ اور فکر انگیز معلومات سے پر ہے۔ طرز بیان انتہائی سادہ 'مگر دلنشین ہے۔ مصنف کا اسلوب تحریر ایک لحاظ سے بالکل منفرد ہے۔ وہ ضرب الامثال اور کہاوتیں ایسی جا بکدستی سے استعمال کرتے ہیں کہ عبارت کے حسن و [illegible] میں اضافے کا موجب بن جاتی ہیں۔ تاریخی عمارات و مقامات کی رنگین اور دیدہ زیب تصاویر نے کتاب کی افادیت و اہمیت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اس کی ضخامت ۱۸۴ صفحات اور قیمت ۱۲۰ روپے ہے۔ مکتبہ وحدت ملی' اردو بازار' لاہور نے اسے بڑی آب و تاب سے شائع کیا ہے۔OO

(بشکریہ "اردو ڈائجسٹ" لاہور' ماہ جولائی)

بقیہ : تذکیر

ماڈل کے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی اپنے دعوے میں سچے نہیں ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مکمل نسخے کے استعمال کرنے کے بعد شفا نہ ہو۔ اس نسخے میں کمی بیشی کرنے کے بعد شفا کی کوئی ضمانت نہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور اتباع کا دعویٰ بھی۔ بہت سے چور دروازے بنا لئے ہیں تاکہ نفس کو اس میں پناہ مل سکے۔ پھر دور حاضر کے حوالے کے ساتھ آسائشوں کی ایک فہرست بھی مرتب کر لی ہے۔

دو راستے الگ الگ ہیں' ان کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ ان کی اپنی ترجیحات الگ ہیں۔ ایک راستہ آخرت کا ہے اور دوسرا دنیا کا۔ دونوں راستوں پر بیک وقت نہیں چلا جا سکتا۔ آخرت کا راستہ اگرچہ دنیا سے ہو کر گزرتا ہے لیکن یہ محض گزر گاہ ہے۔ گزر گاہ میں آدمی محلات تعمیر نہیں کرتا۔ معاشرے کو تبدیل وہی لوگ کریں گے جو اپنے دعوے میں سچے ہونگے۔ وہ اس ماڈل کو اختیار کریں گے جو اس کائنات میں تبدیلی کا سبب بنا تھا۔OO

بقیہ : کہتی ہے تجھ کو خلق خدا...

اتنی ان تحریکوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دہشت گردی کے نتیجے میں ہونے والی خون ریزی سے عربوں میں اسلام پرستی کا جذبہ خاصا سرد پڑ گیا ہے۔ ایک مراکشی صحافی کا کہنا ہے کہ الجزائر میں رونما ہونے والے واقعات کو دیکھ کر ہم اسلام پرستی سے خاصے تائب ہو گئے ہیں۔ موجودہ تصادم سے پہلے بھی الجزائر میں "اسلامک سالویشن فرنٹ" کو کوئی غیر معمولی حمایت حاصل نہ تھی۔ ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں اس نے صرف ۴۰ فیصد ووٹ حاصل کئے تھے جبکہ کل ووٹ بہت کم تناسب میں ڈالے گئے تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اب انہیں اتنے ووٹ بھی نہیں ملیں گے۔

عرب ممالک میں بظاہر اسلام پرستی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے جس کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جا سکے' مگر بہت سے ممالک میں اندر ہی اندر ایک تحریک خاموشی سے جڑ پکڑتی جا رہی ہے' جس کا مقصد نسبتًا ایک آزاد خیال' جمہوری اور دانش مند حکومت قائم کرنا ہے۔ امریکہ اس پوزیشن میں ہے کہ وہ مصر' مراکش' الجزائر' تیونس' اردن' سعودی عرب' بحرین اور اومان کی حکومتوں پر دباؤ ڈال سکے کہ وہ اپنے ہاں جرات مندانہ اصلاحات کا اہتمام کریں۔ تاہم یہ توقع کرنا درست نہ ہو گا کہ ان ممالک میں فوری طور پر مکمل جمہوریت لائی جا سکتی ہے۔ ایک عرب صحافی کا الجزائر کے حوالے سے یہ تبصرہ بے جا نہیں ہے کہ عرب ممالک میں کسی ایک ہی ہلے میں جمہوریت لانے کی کوشش زہر قاتل ثابت ہو گی۔ چنانچہ امریکہ کو موقع شناسی سے کام لینا ہو گا۔ عرب حکمرانوں کا اپنا ایک مزاج ہے۔ وہ کھلے عام مغرب کا پٹھو ہونے کا الزام سر لینے کی حماقت مول نہیں لے سکتے۔ کلنٹن انتظامیہ اس کے لئے ایک راستہ یہ اختیار کر سکتی ہے کہ مالی امداد کے ساتھ سیاسی تبدیلی کی شرط عائد کر دی جائے۔ خصوصًا اپنے پٹھوؤں' یعنی مصر' سعودی عرب اور عرب امارات کے حکمرانوں کو اب صاف صاف بتا دینا چاہئے کہ اگر وہ امریکہ کی پشت پناہی کے خواہاں ہیں تو اپنے ہاں جلد از جلد سیاسی اصلاحات کا اہتمام کریں۔OO (ماخوذ از نیویارک ٹائمز)

بقیہ : توجہ طلب

کے اس کھیل میں شامل ہو گئیں کہ ہم سیاست کو فساق و فجار کے لئے کیوں چھوڑیں —— لیکن "انکھیاں انڈ یکنا" بھی کام نہ آیا۔ گویا نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ اب سیکولر سیاستدان کھل کھیل رہے ہیں۔ ان کے بیرونی آقا انہیں اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ ملک میں لسانی' علاقائی حتیٰ کہ مذہبی فرقہ واریت کے نتیجے میں اللہ کا شدید ترین عذاب ہم پر مسلط ہے۔ ہر گروہ دوسرے گروہوں کو اپنی طاقت کا مزا چکھا رہا ہے۔ لاشوں پر لاشیں گر رہی ہیں اور ہم نیکروں میں گھوم رہے ہیں۔

"فاعتبروا یا اولی الابصار"OO

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مسلمان ممالک کے بارے میں امریکی مؤقف کبھی تبدیل نہیں ہو گا

اسلام کا متبادل --- جمہوریت؟

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

"بنیاد پرستی" کی جگہ "اسلام پرستی" کی اصطلاح نے اسلام کو بطورِ سیاسی تحریک نمایاں کر دیا ہے"

مشرقِ وسطیٰ کے معاملات میں امریکی مشیر کا اپنی حکومت کو "گراں قدر" مشورہ!!

مصر کے صدر حسنی مبارک پر قاتلانہ حملہ' جس کے بارے میں گمان ہے کہ دہشت گرد گروپ "اسلامی جہاد" کی کارستانی ہے' ان بہت سارے امریکیوں کی اس رائے کو تقویت فراہم کرے گا کہ چڑھائی پر تلے ہوئے اسلام کا مشرق وسطیٰ میں راستہ روکنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے بعض بہی خواہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مغرب والوں کو اپنی ہٹ دھرمی چھوڑ کر اب ایک ایسے خطے کے ساتھ نہ صرف یہ کہ معمول کے تعلقات استوار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہئے جہاں اسلام ابھر کر آگے آ رہا ہے بلکہ ان کے ساتھ کاروبار کرنا بھی سیکھیں اور یہ نہ دیکھیں کہ وہ کیوں ہر وقت ہمیں کوستے رہتے ہیں۔ بنیاد پرستی کی جگہ اسلام پرستی کی اصطلاح اس لئے رواج پا رہی ہے کہ اس سے اسلام بطور ایک سیاسی تحریک کے نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

یہ خیال کرنا تو کچھ زیادہ ہی خوش فہمی پر مبنی ہو گا کہ امریکہ اپنا موقف بالکل تبدیل کر لے گا' البتہ اخلاقی اور معاشی طور پر دیوالیہ پن سے دوچار عرب حکمرانوں کے استفادہ کے لئے اسلام کا ایک متبادل موجود ہے' اور وہ ہے جمہوریت۔ ایک ایسی جمہوریت جو بتدریج ہوشمندانہ اصلاحات کے نتیجے میں عمل میں لائی گئی ہو۔ واشنگٹن کی پشت پناہی سے جو جمہوریت آئے گی وہ نہ صرف جنگ پر آمادہ اسلام کا مدمقابل ثابت ہو گی بلکہ اس سے لوگوں کو بہتر ماحول میسر آئے گا نیز وہ عرب حکومتوں کو امریکہ کے قریب لانے میں مددگار ثابت ہو گی۔

مشرق وسطیٰ کے بارے میں ایک امید افزا پہلو یہ بھی ہے کہ سردست وہاں کسی اسلامی جماعت کے برسراقتدار آنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بیشتر تیسری جمہوری ممالک بشمول مصر' تیونس اور مراکش میں انتخابات کی راہ ان پر ویسے ہی بند ہے۔ الجزائر میں ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں اسلام پرستوں کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ اس سے دو سال قبل وہاں کے وزیر اعظم نے جمہوریت پسندی کے جوش جنوں میں دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے "اسلامک سالویشن فرنٹ" کو قانونی درجہ دے دیا تھا۔ مگر مشرق وسطیٰ کی دوسری کوئی حکومت اب ایسی حماقت نہیں کرے گی۔ جن ممالک میں اسلامی جماعتوں کو کام کرنے کی آزادی حاصل ہے وہاں بھی مختلف قسم کی پابندیاں عائد کر کے ان کی قوت کو زائل کر دیا گیا ہے۔ اسلامی بغاوت کا اس لئے کوئی خدشہ نہیں کہ وہاں کے حکمران اپنے ان اندرونی دشمنوں سے غافل نہیں ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں شام میں حافظ الاسد کی بغاوت کے بعد اب تک صرف سوڈان ایک ایسا ملک ہے جہاں ۱۹۸۹ء میں کسی حکومت کا تختہ الٹا جا سکا۔

> "مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریکیں اسلامی جذبے کا نتیجہ نہیں بلکہ سیاسی ناکامیوں' حکومتی جبر' عسکری بودے پن' معاشی بدنظمی اور بدعنوانی کا ردعمل ہیں"

ان حالات میں اقتدار میں آنے کا ایک ہی ذریعہ باقی رہ جاتا ہے' یعنی عوامی انقلاب کے ذریعے اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے۔ ۱۹۷۹ء میں آیت اللہ خمینی ایران میں شاہ کا تختہ الٹنے میں اس لئے کامیاب ہو گئے کہ وہاں کا درمیانہ طبقہ شاہ کی حکومت سے تنگ آ چکا تھا۔ ورنہ لوگوں کو اسلامی حکومت قائم کرنے سے شاید ہی کوئی دلچسپی تھی۔ اب لوگ خاصے سمجھدار ہو گئے ہیں۔ جب تک انہیں فوج اور دوسرے سرکاری محکموں میں ملازمتیں وغیرہ ملتی رہتی ہیں وہ کسی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے خواہ وہ حکومت کیسی بھی ہو' جبکہ متوسط طبقہ کی عملی شرکت کے بغیر کسی حکومت کو ہٹانا ممکن نہیں۔ چنانچہ مصر اور الجزائر میں کسی بنیادی تبدیلی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا' کیونکہ دونوں ممالک میں درمیانہ طبقہ اپنے حکمرانوں سے متنفر ہونے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی اسلامی حکومت سے بھی خائف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصر میں اسلامی دہشت گردی کا اثر کم ہو کر نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ اسی طرح الجزائر کی خانہ جنگی بھی اب تعطل کا شکار نظر آتی ہے۔

مشرق وسطیٰ میں اسلامی تحریکیں اسلامی جذبے کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ سیاسی ناکامیوں' حکومتی جبر' عسکری بودے پن' معاشی بدنظمی اور بدعنوانی کا ردعمل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سب سے زیادہ وہ لوگ ان تحریکوں میں کشش محسوس کرتے ہیں جو سب سے زیادہ محرومیت کا شکار ہیں۔ جتنی یہاں کی حکومتیں لوگوں کے مسائل حل کرنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں

(باقی صفحہ پر)

"اخلاقی اور معاشی طور پر دیوالیہ پن سے دوچار عرب حکمرانوں کیلئے اسلام کا ایک متبادل موجود ہے' وہ ہے جمہوریت!"

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پریس ریلیز

عقیدۂ ختم نبوت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے

آج انسانیت کو "مصطفوی ورلڈ آرڈر" کی شدید ضرورت ہے

علماء کی عظیم اکثریت نظام عدل اجتماعی کی اہمیت سے یکسر نابلد ہے!

۱۱/ اگست کو جامع القرآن' قرآن اکیڈمی لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کا خطاب جمعہ

ختم نبوت امت مسلمہ کا اجماعی عقیدہ ہے جس پر مسلمانوں کے تمام مسالک اور فرقوں میں چودہ سو سال سے مکمل اتفاق پایا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے قرآن اکیڈمی لاہور میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے کہا ختم نبوت کا انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے چنانچہ قادیانیوں کو بحیثیت گروہ کافر قرار دینا امت مسلمہ کی تاریخ کا منفرد واقعہ ہے جس میں کسی گروہ کو اجتماعی طور پر کافر قرار دے کر امت مسلمہ سے نکال دیا گیا ہو۔ ختم نبوت کے دو پہلوؤں کے حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ امت مسلمہ کے اولین دور میں بھی خلافت کا نظام رائج تھا جبکہ امت کے آخری دور میں بھی نبوی طریق پر مبنی خلافت کا نظام لازماً قائم ہو گا۔ یہ دور بہت جلد آنے والا ہے۔ انہوں نے کہا کہ امت کے ابتدائی دور میں بھی بہت سے منکرین ختم نبوت سامنے آئے تھے جبکہ امت کے دور آخر میں مرزا غلام احمد قادیانی نے جھوٹی نبوت کا فتنہ کھڑا کر دیا۔ اس فتنے کے سدباب کے لئے علماء امت نے بے مثال خدمات پیش کیں اور امت کو ایک بڑے فتنے کے شر سے محفوظ رکھنے کا حق ادا کر دیا۔

انہوں نے ختم نبوت کی اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ لفظ "ختم" کا ایک مفہوم کسی شے کا ختم ہو جانا ہے جبکہ دوسرا مفہوم کسی کام کی تکمیل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ان دونوں مفہوم کا احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ نبوت و رسالت کا کامل اطلاق صرف اور صرف حضور اکرمؐ کی ذات مبارکہ پر ہوتا ہے۔ حضرت آدم سے حضرت عیسیٰؑ تک تمام انبیاء کو اللہ کے ساتھ مختلف نسبتیں حاصل ہیں مگر حضورؐ نسبت رسالت کے اعتبار سے گروہ انبیاء میں منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ آپ سے پہلے آنے والے انبیاء کی نبوت علاقائی و قومی سطح پر محدود تھی مگر حضورؐ دنیا کے واحد رسول ہیں جن کا پیغام عالمگیر اور آفاقی ہے' اس لئے آپ کو بین الاقوامی اور عالمی رسول کا مرتبہ و اعزاز حاصل ہے جو آپ کی فضیلت کلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت بنی اسرائیل تک محدود تھی جسے موجودہ مسیحیت کے بانی سینٹ پال نے غلط طریقے سے عمومی رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن مجید کے نزول سے ہدایت ربانی تکمیل کو پہنچ گئی۔ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے چھ سو سال قبل اور چھ سو سال بعد کا عرصہ انسانی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور سے پہلے انسان ذہنی و عقلی طور پر پوری طرح باشعور نہیں تھا۔ اس کو کامل ہدایت کی بجائے ابتدائی ہدایات دی گئیں جبکہ آخری نبوت کے ظہور کے وقت انسان ذہنی و عقلی طور پر باشعور ہو چکا تھا۔ لہٰذا انسانوں کو قرآن مجید کی شکل میں ایک جامع و آخری ہدایت نامہ دے دیا گیا جسے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔

اس ہدایت نامہ کے ہوتے ہوئے نئی وحی اور نبوت کا تصور ہی عقلی اور دینی اعتبار سے غلط اور بے بنیاد ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ دور حاضر کے انسانوں کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت عادلانہ نظام کا قیام ہے جس کے ذریعے مرد اور عورت' صنعت کار اور مزدور' فرد اور ریاست کے مابین عدل توازن پر مبنی نظام قائم کیا جائے۔ اجتماعی زندگی کے ان تینوں پیچیدہ اور ناگزیر پہلوؤں میں توازن اور عدل قائم کرنے کا نام "اسلامک جسٹ ورلڈ آرڈر" یعنی نظام خلافت ہے۔ انہوں نے کہا انسانوں کی عظیم اکثریت نظام باطل کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے پوری دنیا کا تمدن فاسد ہو چکا ہے۔ اس باطل نظام کی ہمہ گیر گرفت کو توڑنا مذہبی طبقہ کی سوچ سے خارج ہو چکا ہے اور طبقہ علماء کے سامنے عادلانہ نظام کے قیام کی ضرورت ہی سرے سے موجود نہیں رہی۔ موجودہ دور میں عالیشان نجی سجائی مساجد اسلام کی حقیقی تعلیمات سے خالی ہو چکی ہیں اور علماء کے نام سے دنیا پرست مذہبی بہروپئے بدترین مخلوق بن کر فتنہ پرور طبقہ بن چکے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی صداقت انفرادی سطح پر تو تسلیم شدہ حقیقت ہے مگر اسے عملی طور پر رائج کئے بغیر اجتماعی سطح پر حجت قائم نہیں کی جا سکتی۔ اسلام کو اجتماعی سطح پر نافذ نہ کرنے کی اجتماعی سزا سے پوری امت دوچار ہے۔ حضورؐ اور آپ کے صحابہؓ نے دین کے غلبہ کی جدوجہد انسانی سطح پر کی جس کی پیروی ہی سے آج بھی دین کو غالب اور سربلند کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا محض دعاؤں اور نیک تمناؤں کا سہارا لے کر اسلام کے غلبہ کی امید کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔

☆☆☆☆☆